ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

مولانا صدرالدین اصلاحی رحمۃ اللہ
سید جلال الدین عمری (دہلی)

اختلاف قراءت اور احادیث نبوی
پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی (علی گڑھ)

قرآن مجید اور تسخیر کائنات
ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی (علی گڑھ)

سیاستِ عادلہ (اسلامی فکر کا مطالعہ)
مولانا سلطان احمد اصلاحی (علی گڑھ)

اصحاب صفہ اور اشاعتِ اسلام (ترجمہ)
پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی (بھوپال)

تبصرے

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی

ان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جنوری ——— مارچ ۲۰۰۵ء

مدیر

سید جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

پان والی کوٹھی دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

پوسٹ بکس نمبر ۹۳

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد:۲۴ شمارہ:۱

ذی الحجہ ۱۴۲۵ھ ——— صفر ۱۴۲۶ھ

جنوری ——— مارچ ۲۰۰۵ء

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۲۵روپے
سالانہ	۱۰۰روپے
سالانہ (لائبریریاں واِدارے)	۱۲۵روپے

بیرونِ ملک

سالانہ انفرادی	۴۰۰روپے
سالانہ ادارے	۶۰۰روپے

پاکستان

سالانہ انفرادی	۲۰۰روپے
سالانہ ادارے	۳۰۰روپے

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے دعوت آفسٹ پرنٹرس دہلی۔۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

اختلافِ قراءت اور احادیثِ نبوی — پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی — ۲۰

بحث ونظر

قرآن مجید اور تسخیرِ کائنات — ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی — ۴۰

سیاستِ عادلہ (اسلامی فکر کا مطالعہ) — مولانا سلطان احمد اصلاحی — ۶۳

ترجمہ وتلخیص

اصحابِ صفّہ اور اشاعتِ اسلام — ڈاکٹر حارث سلیمان الضّاری — ۹۰

مترجم: پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

تعارف وتبصرہ

قاموس الفاظ و اصطلاحاتِ قرآن — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۷

اشاریہ ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ — ,, — ۱۱۹

زیورات میں زکوٰۃ — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۲۰

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۔ ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی

سینیر سائنٹسٹ ونائب صدر مسلم ایسوسی ایشن فاردی ایڈوانس منٹ آف سائنس،

دارالفکر، اقرا کالونی، علی گڑھ

۳۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۴۔ ڈاکٹر حارث سلیمان الضّاری

کلیۃ الدراسات الاسلامیۃ والعربیۃ، دبئ، متحدہ عرب امارات

۵۔ پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں ندوی

دارالھدیٰ، سعید کالونی، بھوپال

۶۔ محمد رضی الاسلام ندوی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۷۔ مولانا محمد جرجیس کریمی

رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۸۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

حرف آغاز

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ

——— سید جلال الدین عمری

معاصر ماہ نامہ 'افکارِ ملی' نئی دہلی، بیسویں صدی کی سو (۱۰۰) اہم شخصیات پر خاص نمبر نکال رہا ہے۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس صاحب کی خواہش پر میں نے مولانا صدرالدین اصلاحی مرحوم پر ایک مضمون لکھا، لیکن صفحات کی تنگ دامنی کی وجہ سے یہ مضمون شاید اختصار کے ساتھ ہی اس میں جگہ پا سکے گا۔ ادارۂ تحقیق اور 'تحقیقاتِ اسلامی' سے مولانا مرحوم کے تعلق کا تقاضا محسوس ہوا کہ یہ پورا مضمون سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی میں شایع ہوجائے اس سے قبل مولانا کے انتقال کے دو ایک ماہ بعد ہی راقم نے جنوری۔ مارچ ۱۹۹۹ء کے شمارے میں مولانا پر ایک مضمون لکھا تھا۔ پیشِ نظر مضمون میں سابقہ مضمون کے ضروری اقتباسات حذف و اضافہ کے ساتھ لے لیے گئے ہیں، البتہ مولانا کی تصنیفات کا تعارف پہلے مضمون میں نہیں ہوسکا تھا۔ اس مضمون میں ان کا مختصر تعارف دیا گیا ہے (جلال الدین)

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی امت مسلمہ کو جو چند علمی شخصیات ملیں ان میں ایک نمایاں شخصیت مولانا صدرالدین اصلاحی کی تھی ۔ مولانا اپنے علم وفہم اور دینی بصیرت کے لحاظ سے برصغیر ہی کے نہیں عالم اسلام کے ممتاز فرد تھے ، لیکن اپنی خاموش طبعی اور استغناء کی وجہ سے ملکی ، سیاسی اور ملی سرگرمیوں میں کم ہی نظر آتے تھے ، حالاں کہ ان سے کم تر سطح کے اور چھوٹے قد کے لوگ ابھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی موقع ملے، نمایاں ہونے اور اپنے وجود کا احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا اسے سخت ناپسند کرتے تھے۔ مولانا کی شخصیت اس سے بہت بلند تھی۔

مولانا کا سراپا

مولانا کا رنگ گندمی تھا۔ دبلے پتلے، چھریرے بدن کے اور کشیدہ قامت تھے۔ انتقال تک بھی اس سرو قدی میں فرق نہیں آیا تھا۔ گفتگو آہستہ آہستہ اور رک، رک کر کرتے تھے، چلتے تیز قدم تھے۔ غذا اور لباس میں بڑی سادگی تھی۔ آخری دور میں صاحب زادگان کی توجہ سے غذا میں تھوڑا سا اہتمام ہونے لگا تھا۔ اس کی ایک وجہ علالت بھی تھی۔ لباس سادہ ہی رہا۔ بغیر کالر کے قمیص اور تنگ موری کا پائجامہ اور کپڑے کی ٹوپی عام لباس تھا۔ سردیوں میں زیادہ تر گرم چادر اوڑھے رہتے۔ موسم کے لحاظ سے شیروانی بھی استعمال میں رہتی۔ ایک وہ وقت بھی ان آنکھوں نے دیکھا ہے کہ اپنی دس بارہ سال پرانی شیروانی الٹ کر سلوائی تھی۔ اس وجہ سے کاج اور بٹن کا رخ بدل گیا تھا۔ ہنس کر فرمایا: بہت پرانی شیروانی ہے، لیکن ابھی تک گرم ہے۔ لکھنے کے لیے ہمیشہ پین (Pen) استعمال کرتے۔ کبھی کبھی پنسل سے بھی کام لیتے۔ خط بہت نفیس اور عمدہ تھا۔ تحریر بالکل صاف اور واضح ہوتی۔ ایک ایک نقطہ اور شوشہ اپنی جگہ پر ہوتا۔

مولانا بہت زیادہ سوشل نہیں تھے۔ کسی قدر کم آمیز تھے لیکن مزاج میں خشکی بالکل نہ تھی حلقہ احباب میں خاصے بے تکلف ہوتے اور بہت کھل کر باتیں کرتے۔ مولانا کی زندگی میں نماز با جماعت کا خاص اہتمام تھا۔ بیماری اور کم زوری کی حالت میں بھی مسجد جانے اور جماعت میں شریک ہونے کی کوشش کرتے۔ بہت ہی مجبوری یا غیر معمولی نقاہت ہی کی صورت میں گھر پر نماز ادا فرماتے۔ آخر عمر میں نماز میں خشوع اور انابت کی کیفیت زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ مسنون اذکار اور دعاؤں کا بھی ممکنہ حد تک اہتمام کرتے۔

مختصر حالاتِ زندگی

مولانا صدرالدین اصلاحی ۱۹۱۶ء میں اعظم گڑھ کے ایک گاؤں سیدھا سلطان پور میں پیدا ہوئے۔ مولانا کے والد جلیل احمد خان مرحوم حافظ قرآن تھے اور زندگی بھر

درس و تدریس میں لگے رہے۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم موضع بندول (علامہ شبلی نعمانی کا وطن) میں ہوئی جو آپ کا نانھیال تھا۔ بلریا گنج سے مڈل پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخلہ لیا (نمبر داخلہ ۱۲۰۹) اور ۱۹۳۷ء میں فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں بھی بہ حیثیت طالب علم رہے۔ لیکن اس کی مدت چند دنوں سے زیادہ نہیں رہی۔

مولانا مودودیؒ اور جماعتِ اسلامی سے تعلق

مولانا صدرالدین اصلاحی کو دور طالب علمی ہی سے تحریر و تصنیف کا ذوق رہا۔ یہی ذوق مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی سے تعلق کا ذریعہ بنا۔ مولانا کا مقالہ 'مسلمان اور امامت کبریٰ' ۱۹۳۷ء میں ماہنامہ ترجمان القرآن جیسے وقیع رسالہ میں شائع ہوا (یہ مقالہ پورے ساٹھ برس بعد ۱۹۹۸ء میں مولانا کے صاحب زادے عزیزم رضوان احمد فلاحی کے اہتمام سے کتاب کی شکل میں شائع ہوا ہے) مولانا مودودیؒ کی مردم شناس نگاہوں نے دیکھ لیا کہ اس نوجوان میں تحریر کی غیر معمولی صلاحیت ہے اور وہ دین کا بہترین خادم بن سکتا ہے۔

اسی زمانہ کی بات ہے کہ چودھری نیاز علی صاحب نے اپنی بہت بڑی جائیداد (جمال پور، پٹھان کوٹ) وقف کی اور مولانا مودودی کو پیش کش کی کہ وہ وہاں اپنے منصوبہ کے مطابق کام کریں۔ چناں چہ مولانا ۱۸ر مارچ ۱۹۳۸ء کو حیدر آباد سے جمال پور، پٹھان کوٹ پہنچ گئے اور اکتوبر ۹۳۸ء میں تحریک دارالاسلام کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔ اسی عرصہ میں مولانا مودودی کی دعوت پر مولانا صدرالدین اصلاحی دارالاسلام پہنچے۔ ادھر چودھری نیاز علی صاحب کی بعض شرائط اور پابندیوں کو مولانا مودودیؒ نے پسند نہیں کیا اور اختلافات کی بنا پر ۲۶ر جنوری ۱۹۳۹ء کو جمال پور کو خیر آباد کہہ کر لاہور منتقل ہوگئے۔ مولانا صدر الدین اصلاحی بھی لاہور تشریف لے گیے، لیکن جلد ہی چودھری نیاز علی صاحب نے مولانا مودودیؒ کی شرائط تسلیم کرلیں اور جمال پور واپس

آنے کے لیے اصرار کیا۔ مولانا مودودیؒ دوبارہ ۱۵؍جون ۱۹۴۲ء کو جمال پور لوٹ آئے۔ جب تقسیم کے ہنگامے شروع ہوئے اور پوری بستی فساد کی لپیٹ میں آ گئی تو مولانا کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ یکم ستمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور منتقل ہونا پڑا۔

مولانا صدرالدین اصلاحی ۱۹۴۰ء تک مولانا مودودیؒ کے ساتھ رہے۔ غالباً ۱۹۴۱ء میں اپنے وطن سیدھا سلطان پور لوٹ آئے اور اپنے استاذ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کے مشورہ سے رنگون (برما) کے ایک دینی مدرسہ دارالعلم جمعیۃ العلماء برما میں تدریسی خدمات انجام دینی شروع کر دیں۔ ۲۶؍اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی اور مولانا مودودیؒ امیر جماعت مقرر ہوئے۔ مولانا مودودی نے خط لکھ کر مولانا صدرالدین اصلاحی صاحب کو اطلاع دی کہ وہ جماعت کے رکن بنا لیے گئے ہیں۔ مولانا کبھی کبھی مذاق میں کہا کرتے تھے کہ میں جماعت کا بے ضابطہ رکن ہوں۔ مولانا نے جماعت سے اپنے تعلق کا ذکر ایک جگہ اس طرح کیا ہے:

''میری رکنیت کہیے یا تحریکی وابستگی قبل از تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ یعنی ۱۹۳۹ء کے اوائل سے۔ جماعت اسلامی کے قیام سے دو ڈھائی برس پہلے اسی کام کے لیے جس کی خاطر جماعت اسلامی اگست ۱۹۴۱ء میں قائم کی گئی 'دارالاسلام' کے نام سے ایک تحریک کا قیام بمقام جمال پور نزد پٹھان کوٹ پانچ افراد کی تجدید شہادت سے عمل میں آیا تھا۔ ان پانچوں ارکان میں سے ایک یہ ناکارہ بھی تھا۔ بعد میں جب اسی تحریک کا نقش ثانی جماعت اسلامی کے نام سے قائم ہوا تو میں ان دنوں رنگون میں تھا اس کے باعث جماعت کے تاسیسی اجتماع میں شرکت نہیں کر سکا تھا۔ بعد میں مولانائے مرحوم و مغفور نے مجھے اس کی اطلاع دیتے ہوئے میری اسی رکنیت 'تحریک دارالاسلام' کو جماعت اسلامی کی رکنیت قرار دیا تھا۔''

۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم ثانی چھڑ گئی جو ۱۹۴۵ء تک جاری رہی۔ اس سے پوری دنیا کے حالات ہی دگر گوں ہو گئے۔ مولانا برما سے ہندوستان لوٹ آئے۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جماعت کا کل ہند اجتماع اس کے مرکز جمال پور پٹھان کوٹ میں منعقد ہوا۔

مولانا نے اس میں شرکت کی۔ تقسیم سے پہلے ہی دونوں طرف کے حالات ابتر ہونے لگے اور فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مولانا وطن واپس آ گئے اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے وابستہ ہوگئے اور تین سال تک قرآن مجید اور ادب عربی کی تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مولانا مودودیؒ نے پاکستان پہنچنے کے بعد، جب حالات کسی قدر معمول پر آئے تو مولانا صدرالدین مرحوم کو پاکستان آنے کی دعوت دی اور غالباً اس کا انتظام بھی فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی تھی کہ آپ ہندوستان ہی میں رہیں اور یہاں کی جماعت کی خدمت انجام دیں۔

مولانا صدرالدین اصلاحی کو مولانا مودودیؒ کی بہت زیادہ صحبت اور رفاقت حاصل نہیں رہی، لیکن انہوں نے اپنی خدا داد صلاحیت اور ذہانت کی بنا پر مولانا مودودی کے فکر کو جلد ہی پوری طرح جذب کرلیا اور وہ ہندوستان میں اس کے بہترین ترجمان بن کر ابھرے۔ انہوں نے تحریک کے انقلابی فکر کو، جو اصلاً اسلامی فکر ہی ہے، قرآن و حدیث سے مدلّل اور مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں دین کے اجتماعی اور سیاسی پہلوؤں پر زور ملتا ہے۔ اسے انہوں نے بھرپور طریقہ سے پیش کیا ہے۔ مولانا صدرالدین اصلاحی کی تصنیفات میں فرد کی ذات اور اس کے ذہن و فکر اور سیرت کی تعمیر خاص طور پر زیر بحث رہی ہے۔ اس طرح ایک لحاظ سے مولانا صدرالدین اصلاحی کی تحریریں مولانا مودودیؒ کے فکر کی تکمیل کرتی ہیں۔

جماعت اسلامی ہند کے قیام میں مولانا کا حصہ

تقسیم ہند کے بعد ۱۶ر تا ۱۸راپریل ۱۹۴۸ء میں ہروارہ (الٰہ آباد) میں جماعت اسلامی ہند کی تشکیل عمل میں آئی اور مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت منتخب ہوئے۔ اس تاریخی اجتماع میں مولانا نے شرکت فرمائی۔ چند ماہ تک جماعت کا مرکز مدرسۃ الاصلاح سرائے میر رہا۔ اس کے بعد ملیح آباد مرکز بنا لیکن وہاں سے بھی اکتوبر ۱۹۴۹ء میں مرکز رام پور منتقل ہوگیا۔ مولانا بھی جماعت کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے جلد ہی رام پور منتقل ہوگئے اور اب وہ جماعت کے لیے فارغ اور یکسو تھے۔

جماعت میں مولانا کا مقام اور ذمہ داریاں

مولانا جماعت کے مانے ہوئے فکری قائد اور راہنما تھے۔ ان کی فکری عظمت اور بلندی مسلّم تھی۔ وہ جماعت کی فکر کو پوری طرح جذب کئے ہوئے تھے۔ وہ ان نمایاں افراد میں تھے جو اس کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی اور اس کے مقصد اور نصب العین کی طرف راہ نمائی کر سکتے تھے۔ جماعت میں مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا تھا۔ جماعت کا دستور اور مزاج جمہوری ہے۔ اس لیے اختلاف رائے کی یہاں ہمت شکنی ہوتی ہے نہ اسے ناپسندیدہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ بعض مسائل میں اختلاف کے باوجود مولانا نے ہمیشہ مولانا ابواللیث صاحب کا ساتھ دیا اور ان کا تعاون کیا۔ مولانا ابواللیث صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے تمام علمی اور جماعتی وقار کے باوجود اپنی تحریریں اشاعت سے پہلے اپنے رفقاء خاص کو دکھلایا کرتے تھے۔ ان میں مولانا صدرالدین صاحب نمایاں تھے۔ مولانا ابواللیث صاحب مولانا کے مشوروں کو اہمیت دیتے، بلکہ بالعموم ان کی تصحیحات اور ترمیمات کو قبول فرماتے۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد مولانا مودودی نے ہندوستان کے لیے جو شوریٰ نام زد کی تھی اس میں مولانا صدرالدین صاحب کا بھی نام تھا۔ ۱۹۴۸ء میں جب جماعت اسلامی ہند کا قیام عمل میں آیا اور اس کا اپنا علیحدہ نظم قائم ہوا، اس وقت سے ۱۹۹۴ء تک مولانا جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ جماعت کی پالیسی کی تشکیل میں مولانا کا خاص ہاتھ رہا ہے۔ آخری دور میں مسلسل علالت اور صحت کی خرابی کی وجہ سے شوریٰ کے لیے مولانا کا انتخاب عمل میں نہیں آیا۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا مولانا شوریٰ کے اجلاسوں میں پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ جب صحت و تندرستی نے ساتھ چھوڑ دیا تو بالواسطہ ان کے مشورے جماعت کو حاصل رہے۔ اس میں انہوں نے کبھی کمی نہیں کی۔ وہ اعظم گڑھ کے ایک قصبہ پھول پور میں رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود ملک و ملت کے حالات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ حافظہ بہت قوی تھا۔ ہر بات مستحضر رہتی۔

جب کوئی مسئلہ چھڑ جاتا تو اس کی پوری تفصیلات بیان کرتے۔ جماعت کا ماضی اور حال ان کے سامنے تھا۔ ان کی رائیں بڑی مدلل ہوتیں۔ ان کی رائے سے اختلاف ہو بھی تو اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

۱۹۵۶ء میں جماعت کی مجلس نمائندگان وجود میں آئی۔ ہر چار سال بعد اس کا انتخاب ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس کے رکن رہے۔ جماعت کے بالکل ابتدائی دور (۴۸ء) میں جب مولانا کا قیام مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں تھا وہ حلقہ مشرقی یوپی کے قیم مقرر کئے گئے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں مولانا ابواللیث صاحب کی اسیری کے زمانہ میں چھ ماہ تک وہ کل ہند امیر جماعت بھی رہے۔ حلقۂ اتر پردیش کی شوریٰ کے بھی طویل عرصہ تک رکن رہے۔

جماعت کے کل ہند یا بڑے اجتماعات میں مولانا کے دروس یا مقالات شامل ہوتے۔ جماعت کا پہلا کل ہند اجتماع اپریل ۱۹۵۱ء میں رام پور میں ہوا تھا۔ اس میں مولانا کے دو درسِ قرآن ہوئے۔ دوسرے بڑے اجتماعات میں بھی مولانا کے دروس کا سلسلہ رہا ہے۔ بعض اوقات اس طرح کے بڑے اجتماعات کے لیے طویل مقالات بھی لکھے۔ جماعت کے دوسرے کل ہند اجتماع منعقدہ حیدرآباد نومبر ۱۹۵۲ء میں مولانا نے 'اسلام کے نظامِ معیشت' کے عنوان سے اپنا قیمتی مقالہ پیش فرمایا، جو نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اسی طرح ۲۰/تا ۲۲/فروری ۱۹۸۱ء کے اجتماع حیدرآباد کے لیے 'مسلمان اور دعوت اسلام' کے نام سے مقالہ لکھا۔ مقالہ طویل تھا اس لیے اس کے ضروری حصے راقم الحروف نے اجتماع میں سنائے۔ اس مقالہ کی کتابچہ کی شکل میں برابر اشاعت ہو رہی ہے۔

مولانا نے جماعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ ہر نشیب و فراز میں اس کا ساتھ دیا۔ اس کے لیے ایک سے دو مرتبہ قید و بند کی تکلیف برداشت کی، لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ پہلی مرتبہ ۱۹۵۴-۱۹۵۵ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت سال بھر نظر بند رہے اور دوسری مرتبہ ایمرجنسی میں ڈی۔آئی۔آر اور میسا

میں بائیس ماہ گزارے ۔ جماعت ان کے فکر وعمل کا محور تھی ۔ اس کے علاوہ کسی چیز سے انھیں حقیقی دل چسپی نہ تھی ۔ وہ ان کے غور وفکر اور گفتگو کا مستقل موضوع بنی رہی اور ہمیشہ اس کے استحکام و ترقی کے لیے فکر مند رہے ۔ وہ اسے امت کی سر بلندی اور اس ملک میں اقامتِ دین کا ذریعہ سمجھتے تھے ۔ تحریکوں میں ایسے افراد کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے اور وہ اس کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں، جو صاحب فکر اور صاحب الرائے ہونے کے ساتھ مخلص اور باکردار بھی ہوں، جن کو دیکھ کر تحریک کی پوری تصویر ابھر آئے اور جو تحریک میں مرجع کی حیثیت رکھتے ہوں ۔ مولانا کا شمار جماعت کے ان ہی افراد میں ہوتا تھا ۔

بعض اور ذمہ داریاں

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ ادارۂ تصنیف جماعت اسلامی ہند کے صدر تھے ۔ جب ایک آزاد سوسائٹی کے تحت ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی وجود میں آیا تو اس کے بھی پہلے صدر وہی تھے ۔ جماعت نے پچاس کی دہائی میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی دینی تعلیم کے لیے 'ثانوی درس گاہ' قائم کی ،تاکہ ایک ایسی ٹیم تیار ہو جو جدید علوم کے ساتھ دینی علوم سے بھی آراستہ ہو اور آج کے دور میں اسلام کو فکری اور علمی سطح پر پیش کر سکے ۔ یہ درس گاہ کئی سال تک چلی اور اپنے مقصد میں کامیاب رہی ۔ اس کی نظامت مولانا ہی کے حوالہ ہوئی ۔ مولانا نے اپنے رفقاء سے مشورہ کے بعد اس کا چہار سالہ نصاب مرتب کیا جس میں خاص طور پر قرآن مجید، حدیث ،فقہ اور ادب عربی پر زور تھا ۔ اس طرح کے ادارہ کی ضرورت و اہمیت پر مقالہ لکھا جو اس نصاب کے ساتھ شائع ہوا ۔ پھول پور کے قیام کے دوران مشہور دینی درس گاہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کے آٹھ برس (۱۸/اپریل ۸۲ء - ۳/مئی ۹۰ء) تک ناظم رہے ۔ دعوت ٹرسٹ دہلی اور بورڈ آف اسلامک پبلی کیشنز کے ممبر تھے ۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اساسی ارکان میں شامل تھے ۔

ادارۂ تحقیق سے تعلق

۱۹۸۰ء کے اواخر میں جماعت کی اجازت سے ادارۂ تصنیف جماعت اسلامی ہند کو آزاد ادارہ کی حیثیت دی گئی اور ایک رجسٹرڈ سوسائٹی کے طور پر اس کا قیام عمل میں آیا۔ پہلے اس کا نام ادارۂ تصنیف اسلامی اور بعد میں اس عاجز کے مشورہ سے ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی تجویز ہوا۔ مولانا اس کے صدر اور خاک سار سکریٹری مقرر ہوا۔ ۱۹۷۰ء ہی سے مولانا کا قیام زیادہ تر پھول پور میں رہنے لگا۔ سال میں دو ایک بار ہفتہ دس دن کے لیے علی گڑھ تشریف لاتے۔ یہ سلسلہ بھی زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ اپنی مسلسل علالت اور علی گڑھ سے فاصلہ کی وجہ سے اکتوبر ۱۹۸۵ء میں مولانا نے ادارہ اور اس کی ذمہ داری سے باصرار سبک دوشی اختیار کرلی اور برادر محترم مولانا محمد فاروق خاں صاحب صدر مقرر ہوئے۔ ۲۰۰۱ء میں ادارہ کے صدر کی حیثیت سے اس عاجز کا انتخاب عمل میں آیا اور ڈاکٹر فضل الرحمان فریدی سکریٹری بنائے گئے۔

سہ ماہی تحقیقات اسلامی

جنوری ۱۹۸۱ء میں مولانا کے مشورہ سے ادارہ کا ترجمان سہ ماہی 'تحقیقات اسلامی' جاری ہوا۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ وہ قرآنیات سے متعلق کچھ نہ کچھ اس کے لیے لکھتے رہیں گے، لیکن صرف دو ایک نگارشات ہی مجلّہ کی زینت بن سکیں۔ تحقیقاتِ اسلامی کی لوح پر مولانا کا نام بہ حیثیت نگران شروع میں چھپنے لگا تو مولانا نے بار بار اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ وہ ذہنی یکسوئی چاہتے ہیں اور کسی بھی قسم کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ چناں چہ ایک سال کے بعد مولانا کی خواہش کے احترام میں ٹائٹل پر لفظ نگراں کی اشاعت روک دی گئی۔ ۱۹۷۰ء سے ادارہ کی علمی اور انتظامی ذمہ داریاں عملاً اس خاک سار پر تھیں اور ۱۹۸۰ء سے 'تحقیقات اسلامی' کی ادارت کی ذمہ داری بھی اسی عاجز پر ہے۔ بحمد للہ اب تک یہ بوجھ وہ کسی نہ کسی طرح اٹھا رہا ہے۔

علمی خدمات

مولانا صدرالدین اصلاحی ایک بلند پایہ مصنف اور محقق تھے۔ انھیں تصنیف و تالیف کا خداداد ذوق حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے قلم کے ذریعہ دین کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ مولانا نے مختلف دینی موضوعات پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ٹھوس اور بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ مولانا کی تحریریں ان کے علم و فہم اور دینی بصیرت کی خود شہادت دیتی ہیں۔ وہ کسی موضوع پر سطحی اور دوسرے درجہ کی چیز لکھنے کے عادی نہیں تھے۔ ذیل میں مولانا کی تصانیف کا ہلکا سا تعارف پیش کیا جا رہا ہے:

۱- معرکۂ اسلام و جاہلیت

یہ مولانا کے بالکل ابتدائی دور کی تصنیف ہے۔ تقسیم سے قبل لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ بعد میں مولانا نے اس پر تفصیل سے نظر ثانی فرمائی اور اپنے مواد اور مشمولات کے لحاظ سے اسے بالکل نئی شکل دے دی۔ اس میں مولانا نے اسلام اور جاہلیت کا فرق واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے درمیان فکری اور عملی کش مکش پائی جاتی ہے اور قدم قدم پر اس کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کش مکش میں ثابت قدم رہے اور کامیابی حاصل کرے۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر اسرار احمد خان نے کیا ہے۔ نظر ثانی شدہ کتاب اور ترجمہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ سے شائع ہوا ہے۔

۲- اسلام-ایک نظر میں

اس کتاب میں مولانا موصوف نے اسلام کے عقائد و عبادات سے لے کر اخلاق، معاشرت اور سیاست تک تمام پہلوؤں کا جامع تعارف کرایا ہے۔ اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی یہ ایک بڑی کام یاب کوشش ہے۔ اس کتاب کا انگریزی، ہندی، بنگلہ اور ملیالم زبانوں میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

۳- دین کا قرآنی تصور

اس فکر انگیز کتاب میں مولانا نے ایک طرف تو اس غلط تصورِ دین کی مدلّل تردید

کی ہے جو مدتوں سے مسلمانوں کے اندر نفوذ کئے ہوئے ہے اور جس کی وجہ سے خدا کا دین ایک غالب نظام کے مرتبہ و مقام سے محروم ہو کر رہ گیا ہے، دوسری طرف قرآن کی روشنی میں دین کا وہ تصور نکھار کر پیش کیا ہے جو اسلام کا صحیح اور واقعی تصور ہے اور جو اہل ایمان کو اپنی منصبی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فکر مند اور یک سور کھ سکتا ہے۔

۴- اساسِ دین کی تعمیر

تربیت کے موضوع پر یہ بہت اہم کتاب ہے۔ اس میں توحید، آخرت، نماز اور صبر کے بارے میں مولانا نے بہت تفصیل سے اور بڑی عالمانہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اسلام ان بنیادوں پر اپنے پیرووں کی مومنانہ شخصیت کی تعمیر کس طرح کرتا ہے اور انہیں کس طرح حق کی علم برداری کے قابل بناتا ہے۔

۵- حقیقتِ نفاق

تربیت کے موضوع پر مولانا کی یہ ایک اور کتاب ہے۔ قرآن مجید نے اعتقادی نفاق سے بھی بحث کی ہے اور عملی نفاق سے بھی اور دونوں کی علامتیں بھی بتادی ہیں۔ مولانا نے اپنی اس کتاب میں ان ساری باتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور اس امر کی بھی نشان دہی کی ہے کہ ایمان واسلام کے دعوے کے باوجود آدمی اس مرض کا کس طرح شکار بن جاتا ہے۔

۶- اسلام اور اجتماعیت

اسلام میں اجتماعیت کی کیا اہمیت ہے؟ اور کن مصلحتوں کی خاطر وہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعاً وَّلَا تَفَرَّقُوا (سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑلو اور ٹکڑیوں میں نہ بٹ جاؤ) کی تاکید کرتا ہے؟ ملی انتشار کے کیا نقصانات ہیں؟ منظم اجتماعیت کے بغیر دینی زندگی کس طرح ادھوری رہ جاتی ہے؟ اور مطلوبہ اجتماعیت معرض وجود میں کس طرح آتی ہے؟ یہ ہیں وہ اہم موضوعات جن سے اس عالمانہ کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

۷- فریضۂ اقامت دین

اس کتاب میں مولانا نے بتایا ہے کہ اقامتِ دین کیا ہے؟ امتِ مسلمہ کے لیے

اس کی کیا اہمیت ہے؟ آج اس فریضہ کو کس طرح پس پشت ڈال دیا گیا ہے؟ اور اس کے سلسلہ میں جن خدشات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ کتنے نا قابل توجہ ہیں؟ اپنے موضوع پر بہت ہی مدلل، دل نشیں اور ایمان افروز کتاب ہے۔

۸- تحریک اسلامی ہند

یہ کتاب ہندوستان کی اسلامی تحریک اور جماعت کا ایک مکمل اور جامع تعارف ہے۔ یہ تحریک کن حالات میں وجود میں آئی؟ وہ کیا چاہتی ہے اور کیوں چاہتی ہے؟ اس کے لیے وہ کیا ذرائع اختیار کرتی ہے؟ اس کی تنظیم کن بنیادوں پر قائم ہے؟ اس کا نظام تربیت کیا ہے؟ یہ اور اسی طرح کے دوسرے تمام سوالات کا واضح جواب اس کتاب میں موجود ہے۔ 'جماعت اسلامی ہند' کو سمجھنے کے لیے یہ ایک بڑی اہم اور مستند کتاب ہے۔

۹- تیسیر القرآن

مولانا موصوف نے غیر مسلم ذہن کو سامنے رکھ کر 'تیسیر القرآن' کے نام سے ۱۹۵۱ء میں ماہ نامہ 'زندگی' رام پور میں قرآن مجید کی تفسیر بالاقساط شروع کی تھی۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر مکمل ہونے کے بعد یہ کام مختلف وجوہ سے جاری نہ رہ سکا۔ اسی زمانہ میں اس کے پہلے پارے کا ہندی ترجمہ شائع ہوا تھا۔ مولانا کے صاحب زادے عزیزم رضوان احمد فلاحی (مقیم لندن) نے تفسیر کے شائع شدہ حصہ کو مولانا کے بعض دیگر قرآنی مباحث اور مقالات کے اضافہ کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ اس کی اشاعت کا انتظار ہے۔

۱۰- قرآن مجید کا تعارف

یہ کتاب مولانا نے اس خیال سے لکھی تھی کہ وہ 'تیسیر القرآن' کے لیے مقدمہ کا کام دے گی۔ اب یہ مستقل کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں قرآن کریم کے نزول، اس کی تدوین، اس کے کتاب الٰہی ہونے کے دلائل اور اس کی اہم اصطلاحات کی تشریح وغیرہ تمام ضروری امور پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس لیے یہ کتاب قرآن مجید

کے تعارف کا ،خاص طور پر غیر مسلموں میں، بہترین ذریعہ ہے ۔ اس کا ہندی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

ان ضخیم کتابوں کے علاوہ مولانا محترم کے حسب ذیل رسائل بھی شائع ہو چکے ہیں۔

۱۱- اسلام کا نظامِ معیشت

اس رسالہ میں زندگی کے مادی اور اخلاقی تصور حیات سے بحث کرنے کے بعد مولانا نے بتایا ہے کہ اسلام اپنے معاشی نظام کے لیے کیا اخلاقی اور قانونی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر یہ بہت ہی جامع رسالہ ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علیگڑھ نے شائع کیا ہے۔

۱۲- دین کا مطالعہ

اس کتابچہ میں مولانا نے بتایا ہے کہ دین پر عمل کر سکنے کے لیے اس کا علم ضروری ہے ۔اور اس علم کے حاصل کرنے کے لیے قرآن مجید ،سنت رسول ﷺ سنت خلفائے راشدین اور صالح لٹریچر سب کے مطالعہ کی ضرورت اور اہمیت ہے ۔کیوں کہ ان میں سے ہر ایک چیز اپنا خصوصی امتیاز رکھتی ہے۔

۱۳- راہِ حق کے مہلک خطرے

اس رسالے میں مولانا نے یہ حقیقت ذہن نشین کرائی ہے کہ اقامتِ دین کی راہ میں بیرونی خطروں سے زیادہ اندرونی خطرے تباہ کن ہوا کرتے ہیں ۔اس لیے ان کی طرف سے ہوشیار رہنا بہت ضروری ہے ۔ یہ اندرونی خطرات کون کون سے ہیں اور یہ کس طرح سے دعوتی مہم کو ناکام بنا دیا کرتے ہیں؟ اس تفصیل کو جاننے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔

تقسیم ہند کے بعد ہی سے ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک اہم مسئلہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا خطرہ اور پرسنل لا کا تحفظ رہا ہے ۔اس موضوع پر مولانا کے تین رسائل شائع ہو چکے ہیں:

۱۴- یکساں سول کوڈ اور مسلمان

اس رسالہ میں بتایا گیا ہے کہ یکساں سول کوڈ کیا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ ایک مسلمان کے لئے وہ کیوں نا قابلِ قبول ہے؟ اور دین وملت کے لیے وہ اپنے اندر کتنی ہلاکتیں رکھتا ہے؟

۱۵- مسلم پرسنل لا - دینی وملّی نقطۂ نگاہ سے

اس رسالے میں مولانا نے مسلم پرسنل لا، یعنی اسلام کے شخصی اور عائلی قوانین کی شرعی حیثیت، ان کی ملّی اور تہذیبی اہمیت اور مسلمانوں کے لیے ان کی ناگزیریت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

۱۶- نکاح کے اسلامی قوانین

اس رسالہ میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے معاملہ نکاح کی حیثیت، نکاح کے دینی، اخلاقی اور تمدنی مصالح، نکاح کے بنیادی اسلامی احکام اور ان احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں پر روشنی ڈالنے کے بعد واضح کیا گیا ہے کہ یہ اسلامی احکام یکساں سول کوڈ کے ممکنہ قوانین نکاح پر ہر طرح سے برتری رکھتے ہیں۔

۱۷- تلخیص تفہیم القرآن

مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن دور حاضر کی ایک بلند پایہ تفسیر ہے۔ اسے مولانا صدرالدین صاحب نے وقت کی بہترین تفسیر قرار دیا ہے، جو موجودہ ذہن کو یقین وایمان سے ہم کنار کرتی اور حرکت وعمل پر ابھارتی ہے۔ تفہیم القرآن چھ ضخیم جلدوں میں اور ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مولانا صدرالدین صاحب نے زندگی کے آخری سالوں میں اس ضخیم کتاب کی اسی کے الفاظ میں تلخیص کی۔ یہ تفسیر کے میدان میں مولانا کی ایک اہم خدمت ہے۔ اس سے مولانا مودودیؒ کی تحریکی فکر کو مزید وسعت حاصل ہوئی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں اس کا پہلا ایڈیشن نکلا تھا، اس کے بعد سے ۲۰۰۴ء تک اس کے ۲۴ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ۵۰ ہزار سے زائد اس کی اشاعت ہو چکی ہے۔ خیال ہے کہ پڑوسی ملک پاکستان میں بھی اس کی اسی طرح وسیع پیمانے پر اشاعت

ہو رہی ہے، اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ،بعض ہندوستانی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

مولانا محترم نے بعض اہم کتابوں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔

۱۸- اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فقہی اختلافات اور ان کے اسباب پر 'الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ' کے نام سے ایک جامع رسالہ لکھا تھا۔ یہ اسی رسالہ کا رواں اور دل کش ترجمہ ہے۔

۱۹- افادات شاہ ولی اللہؒ

یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مشہور تصنیف 'حجۃ اللہ البالغۃ' کے چند خاص ابواب کا ترجمہ ہے۔

۲۰- حقیقتِ عبودیت

عبادت کے موضوع پر امام ابن تیمیہؒ کا ایک اہم رسالہ' العبودیة' کے نام سے معروف ہے۔ اس میں عبادت کے وسیع اور جامع تصور کی وضاحت کی گئی ہے - یہ کتاب اس رسالہ کا شگفتہ ترجمہ ہے۔

۲۱- متفرق مقالات

مولانا نے مختلف مواقع پر مقالات اور مضامین بھی لکھے ہیں۔ان مقالات کا اب تک کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا ہے۔

مولانا اپنی دینی ،علمی اور تحریکی خدمات کے ساتھ طویل علالت کے بعد ۱۲/نومبر ۱۹۹۸ء کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے ۔اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو شرف قبولیت عطا کرے ،ان کے درجات بلند کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

☆☆☆

تحقیق و تنقید

اختلافِ قراءت اور احادیثِ نبوی

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

مصاحفِ عثمانی کی تدوین کا بنیادی محرک قراءت کا اختلاف تھا، جو نوعیت میں گونا گوں تھا۔ احادیثِ نبوی کے مطابق قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ عربوں کو قراءت میں آسانی رہے۔ سات حروف (سبعة أحرف) کی بحث خاصی پیچیدہ اور مشکل بن گئی ہے، یا مختلف اقوال و افکار نے بنادی ہے۔ اس میں یہ حقیقت فراموش کردی جاتی ہے کہ ہر زبان اور ہر قوم کے لہجے اور تلفظ مختلف ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں بھی یہی صورتِ حال تھی اور آج بھی ہے۔[1]

اختلافِ قراءت اور تعددِ تلفظ علاقائی، جغرافیائی اور قومی/ قبائلی لہجات کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ فصیح زبان، خواہ عربی ہو یا کوئی اور، رنگا رنگ لہجوں، رنگ برنگی قراءتوں اور قسم قسم کے تلفظوں کے امکانات رکھتی ہے۔ ایک دوسری غلط فہمی یہ راہ پاگئی ہے کہ ہر ہر لفظ اور ہر ہر کلمہ میں قراءت مختلف، تلفظ بدلا ہوا اور لہجہ الگ ہوگا۔ ایسا فطری طور سے بھی ممکن نہیں اور لسانی فطرت کے بھی خلاف ہے۔ ورنہ زبان ہی دوسری ہوجائے گی، ایک نہ رہے گی۔ قرآن مجید چوں کہ تمام قبائلِ عرب و عجم اور اقوام ممالک و دیار اور مقاماتِ روئے ارض کے لیے نازل ہوا ہے، لہٰذا سب کی رعایت رکھی گئی۔[2]

تمام عرب قبائل عربی بولتے تھے اور ان کی فصیح زبان یکساں تھی۔ مگر زبان کی حرکت، مقامی اثرات اور تربیتی اختلافات کے سبب بہت سے الفاظ کو وہ ایک جیسا ادا کرنے پر قادر نہ تھے۔ اسی بنا پر صحابہ کرام میں اختلافِ قراءت ہوا۔ عہدِ نبوی کے عربی رسم خط –حمیری خط– میں اعراب اور نقطے نہیں تھے، املا بھی مختلف تھا، حروف کی کشش اور

ملاوٹ میں بھی ایک ترکیبی اندازِ خاص تھا، ان جیسی دوسری وجوہ بھی تھیں۔ لہٰذا اختلافِ قراءت کو روا رکھا گیا۔ اور قراءتِ ابن مسعودؓ ہذلی، قراءت ابوموسیٰ اشعریؓ، قراءتِ ابی ابن کعبؓ خزرجی وغیرہ کے علاوہ قراءتِ کوفہ، قراءتِ بصرہ، قراءتِ عراق اور قراءتِ شام وجود میں آئیں۔ ۳؎

زبانِ قریش بنیادی لہجہ، اصلی قراءت اور فصیح ترین تلفظ تھا جس پر قرآنِ کریم نازل ہوا۔ اس کے باوجود دوسرے علاقوں کے لہجوں، قبائل کی قراءتوں اور قاریوں کے تلفظ کو اس میں سمونے کی گنجائش رکھی گئی، پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام اہلِ زبان بھی ایک ہی جیسے تلفظ، یکساں قراءت اور معیاری لہجہ پر قادر نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ افصح ہوتے ہیں، کچھ فصیح اور کچھ فصاحت کے درجے سے نیچے۔ یہ علم وتعلیم اور تربیت کا معاملہ ہے۔ امّی ہونے کے باوجود رسول اکرم ﷺ افصح العرب تھے کہ آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت فصیح ترین قبیلوں -قریش و ہوازن- کی تعلیم وتربیت اور زبان شناسی کا حصہ رہا تھا۔ اور اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم کا کہ اس ذاتِ رسالت مآب ﷺ کو حاملِ قرآن کریم بنانا تھا۔ قبیلہ قریش میں بھی فصاحت کے لحاظ سے اختلاف و فرق اور امتیاز و اختصاص پایا جاتا تھا۔ مصاحفِ عثمانی کی تدوین کے پسِ منظر میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے لہجہ سے سب سے زیادہ مشابہ تمام صحابہ کرام میں حضرت سعید بن العاص امویؓ تھے، حالاں کہ ان کو حیاتِ نبوی کی برکات سے استفادہ کا موقعہ صرف نو سال ملا تھا۔

فطری اختلاف کے علاوہ رسولِ اکرم ﷺ نے غالبًا سات حروف کی الٰہی رخصت کی گنجائش رکھنے کی خاطر دو قریشی صحابۂ کرام کو ایک ہی سورہ -سورۃ الفرقان- مختلف حروف کے ساتھ سکھائی تھی۔ حضرت عمر بن خطاب عدویؓ نے سورۂ کریمہ کو ذاتِ نبوت ﷺ سے مکہ مکرمہ میں سیکھا تھا، جب کہ حضرت ہشام بن حکیم بن حزام اسدیؓ کو اسی سورت کی تعلیم بعد میں -شاید مدینہ منورہ میں یا ہجرتِ مدینہ کے بعد- ملی تھی۔ حضرت ہشامؓ کی قراءت کے اختلاف نے حضرت عمر عدویؓ کو شدید برافروختہ کردیا تھا۔ خدمتِ

نبوی میں مقدمہ کی پیشی کے دوران معلوم ہوا کہ فریقین کے اختلافِ قراءت کو تعلیمِ نبوی کا جواز حاصل تھا۔[۴]

متنِ قرانی میں اختلافِ قراءت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ قدیم کتبِ تفسیر و حدیث و قرآن میں بھی اور جدید مقالات اور کتابوں میں بھی۔ بعض اہلِ علم نے مصاحفِ عثمانی کے پس منظر میں بھی مختصراً کلام کیا ہے۔ لیکن وہ تدوینِ مصاحفِ عثمانی کے پیش منظر کو دھندلا کر دیتا ہے، کیوں کہ بعض نتائج ایسے اخذ کر لیے گئے ہیں جو اصل بحث سے نہیں نکالے جا سکتے۔ اس لیے اس مقالے میں اختلافِ قراءت کی نوعیت سے تعرض کیا جائے گا۔ اور مکمل بحث کے بعد نتائج و حقائق کو سامنے لایا جائے گا۔ ابن ابی داؤد سجستانی، ابن قتیبہ دینوری، جلال الدین سیوطی وغیرہ کا حوالہ دیا گیا ہے، مگر ہماری بحث حدیثِ نبوی کے حوالے سے ہوگی۔

اختلافِ قراءت کی نوعیت

اس مسئلہ پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی رحمہ اللہ نے ابنِ قتیبہ کی بحث پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تمام اختلافاتِ قراءت کو سات اقسام میں سمیٹا جا سکتا ہے:

۱۔ لفظ کی صورت یکساں مگر اعراب میں اختلاف، اس کے باوجود معنی میں چنداں فرق نہ آئے۔

۲۔ لفظ کی صورت یکساں مگر اس کے اعراب و حرکات سے معانی بدل جائیں۔

۳۔ لفظ کی صورت غیر یکساں، حروف کا فرق، مگر اعراب میں اختلاف نہ ہو، اس کے باوجود معنی میں تبدیلی آ جائے۔

۴۔ لفظ مختلف، مگر معنی یکساں۔

۵۔ لفظ مختلف ہوں اور معنی بھی مختلف ہوں۔

۶۔ کلمہ میں الفاظ میں تقدیم و تاخیر کا اختلاف ہو۔

۷۔ الفاظ میں کمی بیشی پائی جائے۔[۵]

مولانا اکبرآبادی نے مزید لکھا ہے کہ ''یہ اختلافات تو لفظوں میں محدود تھے، ......مصاحف میں اختلاف سورتوں میں کمی بیشی تک کا تھا۔ پھر الفاظ کے تلفظ کا اختلاف بھی تھا، مثلاً قبیلہ ہذیل کے لوگ ''حتّٰی'' کو ''عتّٰی'' بولتے تھے، چنانچہ ''حتی حین'' کو ''عتی حین'' پڑھتے تھے۔ ''تَعلمون'' اور ''تَعلم'' میں اسدی کی قراءت بکسر التاء یعنی ''تِعلمون وتِعلم'' ہے۔ پھر ایک اختلاف یہ بھی تھا کہ عام قاعدہ کے مطابق اِنَّ، أن جو حروف ...... بالفعل ہیں ان کا اسم منصوب ہوتا ہے۔ مگر بعض قبیلے اسے مرفوع پڑھتے تھے، مثلاً: ''اِنَّ هٰذان لَسَاحِرَان'' اور ''ان هذين لساحران''۔[٦]

اس پوری بحث میں حدیثِ نبوی کے ذخیرہ سے استفادہ نہیں کیا گیا ہے اور بالعموم اس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے، لہٰذا ہماری بحث میں اختلافِ قراءت کی نوعیت کو احادیثِ نبوی اور کتبِ حدیث کے حوالے سے مستند کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

کتبِ حدیث میں اختلافِ قراءت

اس بحث کا آغاز دو قریشیوں ۔حضرت عمر عدویؓ اور حضرت ہشام اسدیؓ۔ کے اختلافِ قراءت سے کرنا سب سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ دونوں کی لغت زبانِ قریش تھی، اس کے باوجود ان کی قراءت میں فرق تھا۔ اس سے اہم ترین نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ ''سبعة أحرف'' یا اختلافِ قراءت میں مختلف عرب لغتوں کا دخل نہیں تھا۔ دونوں قریشیوں کی زبان ایک تھی اور ان کے معلمِ اکرم ﷺ کی بھی وہی زبان -قریشی- تھی تو اختلافِ لغت ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اصل اختلاف سے بحث بعد میں کی جائے گی۔ پہلے اختلافِ قراءت کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ان مثالوں کو حافظ ابن عبد البرؒ نے جمع کیا تھا جو عہدِ صحابۂ کرام سے قراءِ عظام سورہ الفرقان کے باب میں اختلافات کے نتیجہ میں پیدا ہوئیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ان کو اختصار مگر اضافوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے شروع ہی میں یہ صراحت بھی کردی ہے کہ صرف ایک جگہ سورہ فرقان-٦١ ''وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجاً'' کو بعض قراء

نے ''جَعَلَ فِيهَا سُرُجاً'' پڑھا ہے۔ یہی ایک مقام ہے جہاں خط میں مصحفِ عثمانی سے فرق نظر آیا ہے، ورنہ موجودہ مصحف عثمانی کے رسم الخط سے باقی اختلافاتِ قراءت لفظی اختلاف نہیں رکھتے! یہ حافظ ابن التینؒ کا خیال ہے اور اس پر ابن حجرؒ کا نقد ملتا ہے۔

نمبر آیت خطِ مصحفِ عثمانی	اختلافِ قراءت
۱۔ تبٰرك الذى نزّلَ الفرقان على عبدِه	تبرك الذى أنزَلَ الفرقان على عِبٰدِه / عَبِيْده
۵۔ وقالوا اساطيرُ الاوّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا	وقالوا اساطيرَ الاولين اكتتبها
۷۔ فيكونَ معه نذيرا	فيكونُ معه نذيرا
۸۔ او تكونُ له جنةٌ يَاْ كُلُ مِنهَا	او يكون له جنة نَاْكُلُ منها
۱۰۔ وَيَجْعَلْ لك قصوراً	ويَجْعَلُ لك قصورا/ ويَجْعَلَ لك قصورا
۱۳۔ واذا اُلْقُوا منها مكاناً ضيقاً	واذا القوا منها مكانا ضِيْقاً مُقَرَّنُوْنَ
مُقَرَّنِيْنَ دعوا هنالك ثُبُوراً	دعوا هنالك ثُبوراً
۱۷۔ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ	وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ/ يَحْشِرُهُمْ وما يعبدون
من دون الله فَيَقُوْلُ......	من دُوْنِنَا فَنَقُوْلُ......
۱۸۔ ما كان يَنْبَغِيْ لنا ان نَتَّخِذَ	ما كان يُنْبَغٰى لنا ان نُتَّخَذَ
۱۹۔ فقد كَذَّبُوْكُمْ بما تقولون فما تَسْتَطِيْعُوْنَ	فَقَدْ كَذَبُوْكم بما يَقُوْلُوْنَ فما يَسْتَطِيْعُوْن
صرفا ولا نصرا ومن يَظْلِمُ مِنكم نُذِقْهُ	صرفا ولا نصرا ومن يظلم منكم يُذِقْهُ
۲۰۔ .. إلا إنَّهم لياكلون الطعام ويَمْشُوْنَ	إلا أَنَّهُمْ لياكلون الطعام ويَمَشُّوْنَ
۲۲۔ .. ويقولون حِجْراً مَحْجُوْراً	ويقولون حُجْراً /حَجْراًمحجوراً
۲۵۔ ويوم تَشَقَّقُ السماء بالغمام ونُزِّلَ الملئكةُ	ويوم تَشَقَقُ السماء بالغمام ونُزِلُ
	(والاصل تنزل)ونَزَّلَ الملئكةَ/ ونَزَلَ الملئكةُ /
	ونُنْزِلُ الملئكةَ/وَنُنْزِلُ/ وَنزلَتْ / وَتنزّلَتْ
۲۷۔ يٰلَيْتَنِى اتَّخذتُ	ليتنى اِتَّخذْتُ
۲۸۔ يٰوَيْلَتٰى	يٰوَيْلَتِىْ (ومنهم من امال: يعنى يٰوَيْلَتِىٰ)

۳۰۔ ان قومی اتخذوا	مِنْ قَوْمِی
۳۲۔ لِنُثَبِّتُ به فوادك	لِیُثَبِّتَ به فوادك
۳۶۔ فَدَمَّرْنٰهُمْ	فَدِمِرنّاهم/فَدِمراهم
۳۸۔ وعَاداً وثَمُوْدَا	وَعاداً وَثَمُوْدَ
۴۰۔ اُمْطِرَتْ مَطَرَالسَّوْءِ	مُطِرَتْ/ اُمْطِرُوْا /اَمْطَرْنٰهُمْ (بعد کے دونوں۔ابن مسعود) مَطَرَالسُّوْءِ / مطرالسُّوْ/ مَطَرَالسَّوّ/ مطرالسَّوِ
۴۱۔ ...الا هُزُواً اهذاالذی بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلاً	هُزُواً/ هُزُوا (بغیر همزه) اختاره الله من بَیْنِنَا
۴۲۔ عن الهتنا	عن عبادة الهتنا (ابن مسعود و ابی)
۴۳۔ أرء یت من اتخذ الٰهه هوٰه	أرء یت من اتخذ اِلٰهَةً/اُلٰهَةً (اول: ابن مسعود)
۴۴۔ ام تَحْسَبُ ان اکثرهم یسمعون او یعقلون	ام تحسَبَ (فتح السین؟) ان اکثرهم لیسمعون او یُبصِرون (ابن مسعود)
۴۸۔ وهو الذی اَرْسَلَ الریٰح بُشْراً	وهو الذی جَعَلَ (ابن مسعود) الریٰح بُشْرا/بَشْراً بُشْریٰ
۴۹۔ لِنُحْیِیَ به بلدة مَیْتاً ونُسْقِیَهٗ... وَاَنَاسِیَّ	لِنُنْشِربه (ابن مسعود) /بلدةً مَیِّتاً ونَسْقِیَهٗ اَنَاسِیَ
۵۰۔ ولقد صَرَّفْنٰهُ بینهم لِیَذَّکَّرُوْا	ولقد صَرَفْنٰهُ بینهم لِیَذْکُرُوا
۵۱۔ وهذا مِلْحٌ اُجَاجٌ ... وَحِجْراً محجورا	وهذا مَلِحٌ اُجَاجٌ ... حُجْرا محجورا (سابق قراءت)
۵۹۔ الرحمٰنُ فَسْئَلْ به	الرحمٰنِ فسئل به / الرحمٰن فاسئل به /فَسَلْ به
۶۰۔ ...لِمَا تَاْمُرُنَا وزادهم نفورا	لِمَا یَاْمُرُنَا/ لما تامرنا به (ابن مسعود)
۶۱۔ ... سرٰجاً وقمراً مُنِیْراً	سُرُجاً وقُمْراً مُنِیراً
۶۲۔ لمن اراد ان یَذَّکَّرَ	لمن اراد ان یَذْکُرَ/ یتذکر (ابی بن کعب وابن مسعود)
۶۳۔ وعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الذین یَمْشُوْنَ	عُبَّادُ الرحمٰنِ / عُبُدُ الرحمن/عَبدالرحمٰن؟ الذین یَمَشُّوْنَ

۶۴۔ یَبِیْتُوْنَ لربھم سُجَّداً	یبیتون لربھم سُجُوداً
۶۶۔ مستقرا و مُقَاماً	مستقراً ومقاماً
۶۷۔ وَلَمْ یَقْتُرُوْا و کان بین ذلك قَوَاماً	ولم یُقْتِرُوْا/ ولم یَقَتِّرُوْا / ولم یَقْتِرُوْا و کان بین ذلك قِوَاماً/ و کان بین ذلك قَوّاماً
۶۸۔ یَلْقَ اَثَاماً	یَلْقٰی اَثَاماً/ یُلَقَّ اثاما (اول: ابن مسعود)
۶۹۔ یُضٰعَفُ له العذابُ یوم القِیٰمة و یَخْلُدْ فِیْهٖ مُھَاناً	یَضعَفُ له العذابُ / یُضَعَّفُ له العذابُ /نُضٰعِفُ له العذابَ یوم القیمة و یُخَلَّدْ / یُخْلَدُ / تُخلد فیه مُھَاناً
۷۴۔ من ازواجنا و ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ	من ازواجنا و ذرّیتنا قُرّاتَ (ابن مسعود)
۷۵۔ یُجْزَوْنَ الغُرْفَةَ بما صبروا وَ یُلَقَّوْن فیها	یُجزون الجَنَّةَ (ابن مسعود) بما صبروا ویَلْقَوْنَ فیها
۷۶۔ فقد کَذَّبْتُمْ	فقد کَذَّبَ الکافرون (ابن مسعود وابن عباس وابن الزبیر) فقد کَذَبَ الکافرون
فسوف یکونُ لِزَاماً	فَسَوْفَ تَکُوْنُ لَزَاماً

حافظ ابن حجرؒ نے سورۂ فرقان میں اتنے اختلافاتِ قراءت کی نشان دہی کی ہے اور بڑی عرق ریزی سے کی ہے۔ ہمارے مطبوعہ نسخہ (فتح الباری، طبع دارلسلام ریاض ۱۹۹۷ء) میں غضب یہ ہوا ہے کہ آیاتِ قرآنی کا املا بسا اوقات مصحفِ عثمانی کے مطابق نہیں ہے، بلکہ جدید عربی املا اختیار کرلیا گیا ہے۔ معلوم نہیں یہ حافظ ابنِ حجرؒ کی جدّت ہے یا مرتبینِ جدید کی۔ بظاہر موجودہ ناشرین ہی کی حرکت معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ آج کل آیاتِ قرآنی کے املا میں مصحفِ عثمانی کے خط کی پیروی نہیں کی جاتی۔ معلوم نہیں اس میں سہل انگاری کو دخل ہے، یا کسی اور وجہ کو۔ لیکن اس سے قراءت و کتابت کے فرق کو واضح کرنا مشکل ہوجاتا ہے اور بلا وجہ اختلافات کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ حالاں کہ اصل املا میں لفظ/ الفاظ کی قراءتِ مختلفہ کا امکان بخوبی پایا جاتا ہے۔ مثلاً جہاں سے بحث کا آغاز کیا ہے وہیں ''وجعل فیھا سراجا'' لکھا گیا ہے، حالاں کہ

مصحف میں املا ہے ''وجعل فیھا سِرٰجاً'' اسے بہ آسانی ''سِراجاً'' کے بجائے ''سُرُجاً'' پڑھا جاسکتا ہے اور لفظ کے املا میں فرق بھی نہیں آتا جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ خطِ مصحف میں تصحیف/تبدیلی کی دوسری مثالیں ہیں: تبٰرک کی جگہ تبارک، الملٰئکة کے بجائے الملائکة، یلیتنی کی جگہ یا لیتنی، یٰویلتٰی کی جگہ یا ویلتی، فدمّرنٰھم کی بجائے فدمّرناھم، فَسْئَل کی جگہ فاسأل، یُضٰعَفُ کی جگہ یضاعف وغیرہ۔ بظاہر یہ حافظ ابن التینؒ کے خطِ تصحیف کی لغزش معلوم ہوتی ہے کہ انہی نے سراجا اور سرجا کے املا کو مصحفِ عثمانی کے خط سے الگ قرار دیا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب عدویؓ قریشی اور حضرت ہشام بن حکیم اسدیؓ قریشی نے سورۂ فرقان کی قراءت میں جو اختلاف کیا تھا وہ اسی قسم کا رہا ہوگا جس طرح ایک قسم کے املا والے لفظ کی دو قراءتوں میں ہوسکتا ہے۔ جیسے علیٰ عبده کی بجائے علیٰ عبٰدِہ، ''تکون له جنة'' کی جگہ ''یکون له جنة'' یا ''یجعل لک قصورا'' میں لفظ ''یجعل'' کا مختلف اعراب۔ غالباً دونوں بزرگوں کا اختلاف ایک املا والے الفاظ کی قراءتوں کا ہی رہا ہوگا۔ لغت یا کلمہ کا فرق یا مرادفات کا فرق نہ رہا ہوگا۔ حدیثِ نبوی میں وارد تعبیر: ''علیٰ حروف کثیرة لم یقرئنیھا رسول الله صلی الله علیه وسلم'' اور ''قد أقرأنیھا علی غیر ماقرأت'' وغیرہ سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ اختلاف ''حروف'' کا تھا، نہ کہ ''کلمات'' کا۔ اسی قسم کی بات حافظ ابن حجرؒ نے بھی کہی ہے۔ [۷]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سورۂ فرقان کے اختلافاتِ قراءت سے متعلق ایک مزید صراحت یہ کی ہے کہ جو کچھ وہ پہلے لکھ چکے تھے اس کے بعد ان کو ایک ''کتابِ کبیر'' کا علم ہوا جو ان کے شیوخ کے شیخ ابوالقاسم عیسٰی بن عبدالعزیز لخمی کی لکھی ہوئی ہے اور جس کا عنوان ہے: ''الجامع الأکبر والبحر الأزخر'۔ وہ تیس جلدوں میں ہے اور اس میں سات ہزار روایاتِ مختلفہ کا بیان ہے۔ سورۂ فرقان میں حافظ ابن حجرؒ کی بیان کردہ چیزوں کے قریب قریب اس کتابِ کبیر میں اختلافات ہیں اور سورہ کی ترتیب

کے ساتھ ان کی مزید وضاحت اختلاف بہ اختلاف اور قراءت بہ قراءت کی ہے۔ ۸

اہم مسئلہ یہ ہے کہ قراءت کا اتنا اختلاف مصحفِ عثمانی کے مرتب، شائع اور نافذ ہونے کے بعد قراء متاخرین نے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کو ''صحفِ صدیقی'' ملے تھے نہ دوسرے ''مصاحفِ صحابہ''، کیوں کہ وہ سب ضائع کردیے گئے تھے۔ ان اختلافی قراءات میں زبانی روایات کا بھی دخل ہوسکتا تھا اور تھا۔ لیکن خط مصحفِ عثمانی سے الگ املا والے الفاظ کی قراءاتِ شاذ تسلیم کرنی مشکل ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا ہے وہ علمی بحث تو ہوسکتی ہے، مگر قراءاتِ شاذہ کی اجازت دینے سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے، بالخصوص مصحفِ عثمانی کے موجودہ خط نسخ اور اعراب اور نقطوں سے پابند قراءت کے بعد۔ ۹

تسلیم شدہ قراءاتِ سبعہ

موجودہ مصحفِ عثمانی کے رسم الخط کو ''معیاری'' ''ناقابلِ تبدیلی'' ''حتمی'' اور ''آخری'' تسلیم کرنا لازمی ہے۔ اس متفقہ اور اجماع کردہ خط و رسم کے اندر اندر ہی جن قراءات کی گنجائش نکلتی ہے ان کو جائز و صحیح قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ جمہور قراء و ماہرین فن کے مطابق ''قراءاتِ سبعہ'' ہیں۔ یہ صحیح ترین ہے، بعض دوسروں نے ان کی تعداد زیادہ بھی بتائی ہے، جیسے قراءاتِ عشرہ سے ''اربعۃ عشر'' تک۔ یعنی دس سے چودہ قراءتیں، مگر ان پر جمہور ماہرین کا اتفاق نہیں ہے۔ ۱۰

امام زرکشیؒ نے ایک حقیقت یہ بیان کی ہے کہ قراءت یا قراءات توقیفی ہوتی ہیں، اختیاری نہیں: ان القراء ات توفیقیة ولیست اختیاریة ...... بعض علماء جیسے زمخشریؒ وغیرہ کے اختلافِ خیال پر نقد کرکے کہا ہے کہ وہ سنت متبعہ ہے جس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں اور اس کا رسول اکرم ﷺ سے مروی ہونا ضروری ہے۔ بہر حال امام بدر الدین زرکشیؒ نے قراء سبعہ کے اختلاف کو سات صورتوں میں محدود کرکے بیان کیا ہے:

۱۔ کلمہ کے اعراب میں اختلاف ہو مگر املا بدلے نہ معنی، جیسے بُخل، بَخَل، مَیْسَرة، مَیْسُرة

۲۔ کلمہ کے اعراب میں اختلاف سے معنی بدلیں مگر املا نہ بدلے، جیسے باعِدْ بین اسفارنا اور بَاعَدَ بین اسفارنا

۳۔ کلمہ کے حروف میں تبدیلی سے معنٰی بدلیں، مگر رسم خط جوں کا توں رہے، جیسے کَیْفَ نُنْشِزُهَا کی جگہ کَیْفَ نُنْشِرُهَا

۴۔ کلمہ کی صورتِ املا بدلے مگر معنیٰ نہ بدلیں، جیسے صیحة واحدة کی جگہ زقیة واحدة

۵۔ کلمہ کی صورت و معنیٰ دونوں بدل جائیں، جیسے الم تنزیل الکتب کی جگہ الم ذلک الکتاب

۶۔ کلمات میں تقدیم و تاخیر کا اختلاف ہو، جیسے جاء ت سکرة الموت بالحق کے بجائے جاء ت سکرة الحق بالموت

۷۔ بعض حروف یا کلمات کا اضافہ ہو، جیسے وما عملت کی جگہ وما عملت ایدیهم ......[۱۱]

اما زرکشیؒ کی بحث امام ابن قتیبہ دینوریؒ کی بحث سے مختلف نہیں ہے۔ وہی سات صورتیں ہیں۔ ان میں خط اور املا کا فرق بھی پایا جاتا ہے۔

یہ قراء سبعہ درج ذیل تھے:

۱۔ عبداللہ بن کثیر مکی قرشی (م ۱۲۰/۱۲۲ھ/ ۷۳۷-۷۳۸ یا ۷۳۹-۷۴۰ء)

۲۔ نافع بن عبدالرحمٰن مدنی اصبہانی (م ۱۶۹ھ/ ۷۸۵-۷۸۶ء)

۳۔ عبداللہ بن عامر یحصبی دمشقی (م ۱۱۸ھ/ ۷۳۶ء)

۴۔ ابوعمرو بن العلاء بصری (م ۱۴۵ھ/ ۷۶۲-۷۶۳ء)

۵۔ عاصم بن ابی النجود کوفی (م ۱۲۷ یا ۱۲۸ھ/ ۴۴-۴۶ء)

۶۔ حمزہ بن حبیب اسدی کوفی (م ۱۵۶ھ/ ۷۷۲-۷۷۳ء)

۷۔ ابوعلی بن حمزہ کسائی کوفی (م ۱۸۹ھ/۸۰۴-۸۰۵ء)

امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ ''اگر وہ قراءتیں (حضرت) عثمانؓ کے لکھوائے ہوئے مضمون میں سے کسی مصحف میں نہ پائی جائیں تو ان کو شاذ تصور کرنا چاہیے، کیوں کہ وہ متفق علیہ رسم (خط) کے خلاف ہیں'' [۴۲]

مطبوعہ متن قران/مصحف میں بعض قراء کا اختلاف یا قراءت صحیحہ کا ذکر بھی ملتا ہے، جیسے سورۂ ہود۔۴۱: ''بسم اللہ مجرھا'' میں حاشیہ پر لکھا گیا ہے کہ امام حفص نے مجریھا پڑھا ہے: قرأ حفص بضم المیم و إمالة الراء، یا سورہ الروم: ۵۴ میں ''من بعد ضُعُفٍ قوة'' کو حفص نے بضم الضاد بھی پڑھا ہے اور فتحہ کے ساتھ بھی یعنی ضَعْف، جیسے کہ بعض سعودی مصاحف میں ہے۔

کلمات کا اختلاف

روایات میں آتا ہے کہ بعض مصاحفِ صحابہ کرام میں اور قراء کرام کی بعض قراءات میں بھی کلمات کا اختلاف پایا جاتا تھا۔ امام ابن قتیبہ دینوریؒ، حافظ ابن حجرؒ اور بعض دوسرے اکابرِ اہلِ قلم کے حوالے سے اس کا ذکر پہلے بھی اچھا خاصا آچکا ہے۔ بعض مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ نازل شدہ الفاظ کے مرادفات بھی استعمال کرنے کی اجازت سبعہ احرف کے تحت دی گئی تھی۔ جیسے قراءت ابن مسعودؓ میں ''یُجْزَوْنَ الْغُرْفَة'' کے بجائے ''یُجْزَون الجنة'' ہے، یا ''یعقلون'' کی جگہ ''یبصرون'' یا اس کا برعکس پایا جاتا ہے، یا آیتِ کریمہ کے تنزیلی الفاظ میں تقدیم و تاخیر کی اجازت اور سہولت بھی پائی جاتی تھی، جیسے ''جاء ت سکرة الموت بالحق'' کے بجائے بعض بزرگ ''جاء ت سکرة الحق بالموت'' پڑھا کرتے تھے۔ سورۂ فرقان کے اختلافاتِ قراءت میں اس کی متعدد مثالیں گذر چکی ہیں۔

ہمارے علماء کرام اور ماہرینِ فن نے یہاں اس نکتہ پر دھیان نہیں دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ یا رسول اکرم ﷺ کے تعلیم کردہ الفاظ و تعبیرات کے تحت

یہ اختلافاتِ قراءت آتے ہیں یا نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ عربوں کو اپنی جانب سے تنزیلی الفاظ و عبارات کے بالمقابل اپنے غیر منزل مرادفات و کلمات رکھنے کا حق حاصل تھا یا نہیں؟ مولانا اکبر آبادیؒ جیسے بعض اہلِ علم نے دوسرے سوال کے جواب میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ''قبائل کو اس کا اختیار دے دیا تھا کہ لغتِ قریش پر نازل شدہ کسی آیت میں اگر کوئی لفظ کسی قبیلہ کے لیے عسیر التلفظ یا عسیر الفہم ہو تو وہ اس کی بجائے اپنے قبیلہ کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ اجازت موقت ہی ہو سکتی تھی، دائمی نہیں ہو سکتی......''[۱۳]

''غیر الٰہی الفاظ و عبارات'' کو رکھنے کی اجازت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ یہ موقف یا خیال قطعی غلط ہے۔ ایک اور اہم ترین وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کلامِ الٰہی ہے، اس کے الفاظ و عبارات میں تبدیلی اور دوسرے الفاظ و مرادفات لانے کا حق تو رسولِ اکرم ﷺ کو نہیں تھا، چہ جائے کہ عربوں کے جمِ غفیر اور قبائلِ عرب کے ان پڑھ اور ان گڑھ لوگوں کو دے دیا جاتا۔ پھر عام انسانوں/عربوں کو کتنے الفاظ و تعبیراتِ قریش مشکل معلوم ہوتے تھے۔ وہ فصیح عربی تھی جو تمام قبائلِ عرب کے لیے آسان تھی۔ دوسرے ان کو پورے قرآن مجید کے تمام الفاظ و تعبیرات سے واسطہ نہ تھا۔ چند سورتیں ان کے لیے کافی تھیں اور ان میں ایسی کوئی دقت نہ تھی۔ پھر ہر کس و ناکس کو ''تبدیلی الفاظ'' کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اور علماء اور تعلیم یافتہ کے لیے اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لہٰذا مولانا اکبر آبادیؒ اور ان کے ہم خیال اصحابِ علم کا یہ خیال قطعی بے بنیاد ہے کہ قبائلِ عرب کو مشکل قرآنی الفاظ کی جگہ اپنے قبائلی آسان الفاظ و مرادفات کی اجازت دے دی تھی۔ اور وہ بھی رسولِ اکرم ﷺ نے، جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ الفاظ و تعبیرات کے نہ صرف بنفس نفیس پابند تھے، بلکہ دوسروں سے بھی اس کی پابندی کرانے پر مامور تھے۔ منطقی اور نقلی لحاظ سے بھی یہ خیال حقیقت کے خلاف ہے کیوں کہ اللہ کے کلام میں انسانی کلام کا شامل کرنا اس کو غیر الوہی کلام بناتا ہے۔ پھر کسی فقرے، کلمے اور تعبیر کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کیسے کہا

جاسکتا ہے کہ وہ الٰہی کلام ہے۔

ایک اور خطرہ اور انتہائی دور رس اثرات و نتائج کا حامل خطرہ یہ تھا کہ بہت سے عرب قبیلے اور ان کی شاخیں اپنے مقامی لہجے اور بولی کے مطابق الٰہی الفاظ و عبارات کو تبدیل کرتے چلے جاتے۔ اس طرح سے قرآن مجید میں غیر انسانی کلام کی آمیزش ہی نہ ہوتی، بلکہ الٰہی کلام کہیں کہیں انسانی کلام کے بیچ بیچ میں پایا جاتا۔ خود قریش کے بعض افراد و طبقات اور شاخوں کو بھی کچھ الفاظ و عبارات مشکل معلوم ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض اکابر عہد نبوی کے بارے میں روایت آتی ہے کہ ان کو ''اَبّـا'' (سورۂ عبس -۳۱) کے معنی سمجھنے میں دقت ہوئی، تو ان کو بھی مرادف لانے کی اجازت مل جاتی۔

پھر سمجھنے میں مشکل اور ادائی میں مشکل کی کوئی حد نہیں۔ ایک ہی لفظ مختلف علمی، تعلیمی اور تربیتی سطح کے مختلف افراد کے لیے بیک وقت مشکل اور آسان ہوسکتا ہے اور حقیقتاً ہوتا ہے۔ ایسا ایک قبیلہ کے لیے بھی ممکن تھا اور قریش کے لیے بھی۔ بلکہ بسا اوقات ایک لفظ، ایک کلمہ اور ایک تعبیر دو بڑے عالموں اور ماہرینِ قرآن کریم کے لیے بھی بیک وقت مشکل و آسان ثابت ہوا۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا اور ہوسکتا ہے کہ ایک عامی اہلِ زبان کے لیے ایک لفظ کے معنی بالکل واضح تھے اور ہوئے اور دوسرے عالم اہلِ زبان پر اس کے حقیقی معنی مخفی رہ گئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے ماہرِ فن اور حبر (عالم) قرآن کو لفظ ''فاطر'' کا صحیح معنی اور ''خالق'' سے اس کا معنوی فرق دو بدّو عربوں کی گفتگو سے سمجھ میں آیا۔

کلمات و مترادفات کا اصلی سبب

مصاحفِ صحابہ کرام میں اختلاف قراءت کے حوالے سے جو کلمات کا فرق اور مرادفات کا وجود پایا جاتا ہے اس کا اصل سبب یہ نہیں تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ نے الفاظِ قرآنی کی دقتِ معنیٰ اور پریشانیٔ تلفظ کے سبب ان کی اجازت دے دی تھی۔ بلکہ اس کی صحیح وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے بعض الفاظ و تعبیرات کے معانی اپنی زبان میں اور

اپنی فہم کے مطابق حاشیہ میں یا لفظِ قرآنی کے ساتھ عبارت ہی میں لکھ لیے تھے۔ بعد کے لوگوں نے اسے اختلافِ قراءت سے تعبیر کر دیا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف کا معاملہ ہو یا کسی اور کا، اصل وجہ یہی تھی۔ چند مثالوں سے یہ بات زیادہ واضح ہو گی۔

سورہ الفرقان-۴۱: ''اھـذا الـذی بـعـث اللّٰه'' سے متعلق روایت میں ہے کہ حضرت ابن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما نے اس کو پڑھا: ''اختـاره اللـه من بيننا''۔ اصل آیت کریمہ کے تمام الفاظ وکلمات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو سمجھنے میں مشکل ہو یا تلفظ میں دقت طلب۔ پھر پورے قرآنی فقرہ/آیت کو بدلنے کی حاجت پیش آ گئی تھی اور وہ بھی ان دونوں ماہرین فن کو جن میں سے ایک معلّمِ قرآن اور دوسرا کاتبِ وحی تھا اور جن سے قرآن کریم سیکھنے کا حکم رسول اللہ ﷺ نے خود دیا تھا۔ پھر ان کے قبیلے بھی مختلف تھے: حضرت ابن مسعودؓ ہذلی تھی اور حضرت ابی بن کعبؓ خزرجی - دونوں کو اپنی قبائلی زبان کی دقت درپیش ہوتی تو دونوں ایک ہی تعبیر پر کیسے متفق ہو گئے؟ منطقی اور اصولی لحاظ سے اور دعوے کے مطابق دونوں کے مرادفات علیحدہ ہونے چاہیے تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے اعتراض وطنز واستہزاء کو نقل کیا ہے جو وہ رسولِ اکرم ﷺ کو دیکھ کر کرتے تھے کہ اچھا یہی وہ ہیں جن کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ حضرت ابنِ مسعودؓ و ابی بن کعبؓ نے اس کے معنی بتائے کہ اچھا یہی وہ ہیں جن کو اللہ نے ہمارے درمیان سے منتخب کیا ہے۔ یہ اصلاً معنی کی ترسیل، عبارتِ الٰہی کی تسہیل اور مرادِ ربانی کی توضیح وتفسیر ہے نہ کہ قراءت۔ اس کی مزید وضاحت اگلی آیتِ کریمہ-۴۲: ''اِنْ کَادَ لَیُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا'' کی قراءتِ بزرگانِ موصوف سے ہوتی ہے جس میں اضافی کلمہ ملتا ہے یعنی ''ان کـاد لیـضـلـنا عن عبادة الھتنا'' یعنی ان کافروں اور نکتہ چینوں کا الزام تھا کہ اگر ہمارے پاؤں مضبوطی سے جمے نہ ہوتے تو اس رسول (ﷺ) نے ہم کو ہمارے معبودوں (کی عبادت) سے دور کر دیا ہوتا۔ یہاں ''عبـادة'' کے کلمہ کے اضافہ کی کیا ضرورت تھی، جب کہ آیت کریمہ میں نہ کوئی لفظ سمجھنے میں مشکل ہے اور نہ اس کے تلفظ میں کوئی رکاوٹ ہے۔ ظاہر ہے کہ معبودوں

سے دور کرنے کا مطلب یوں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ہمارے بتوں کی عبادت سے ہی بچلا دیتے۔ حافظ ابن کثیرؒ اور دوسرے مفسرین نے یہی معنی لکھے ہیں۔

سورۂ الفرقان کی تمام آیاتِ کریمہ میں جہاں جہاں قراءت میں کلمات و الفاظ کی تبدیلی ملتی ہے وہ قراءت نہیں، بلکہ تفسیری معنی ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان آیاتِ کریمہ کے ساتھ ساتھ افہام و تفہیم کے لیے لکھ لیے یا اپنی قراءتِ قرانِ کریم میں ان کو بطور توضیحی معانی اور تفسیری اظہارات کے آیاتِ متعلقہ کے ساتھ ساتھ پڑھ دیتے تھے۔ ان میں اصل راویوں کا بھی کوئی قصور نہیں۔ انھوں نے ان کو بطور تفسیری قراءات کے بیان کیا تھا جیسے جلالین وغیرہ میں ملتا ہے، مگر ہمارے شارحین نے ان کو قران مجید کے الٰہی الفاظ و کلمات کی مختلف قراءات بنا کر پیش کر دیا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی تمام توضیحی و تفسیری عبارات و کلمات کو تجزیاتی میزان میں پرکھا جائے تو اسی نتیجہ پر۔صرف اسی نتیجہ پر۔ ایک صاحبِ علم و فن پہونچے گا۔ ان کو قراءت قرآن کی دوسری شکل صرف نابلد ہی کر سکتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آیت کریمہ: ۴۴ میں لفظ یا فقرہ ''او یعقلون'' کے معنی بتائے ''او یبصرون'' جو ''یسمعون'' سے لگّا کھاتا ہے۔آیت: ۴۸ میں ''وَهُوَ الَّذِی اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًا '' میں لفظ ''ارسل'' کے ساتھ ''جعل'' پڑھ کر یہ بتایا کہ یہاں مرادِ الٰہی یہ ہے کہ اس نے ہواؤں کو بنایا بشارت دینے والا......اسی طرح آیت: ۴۹ میں ''لِنُحْیِیَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتاً '' (کہ ہم اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کر دیں) کی یہ تفسیر کی یعنی ان ہواؤں کو بکھیر کر (لننشر بہ)......اسی طرح آیت: ۷۵ میں ''یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ'' (بدلہ و جزا میں ان کو غرفہ دیا جائے گا) کا مطلب انھوں نے یہ بتایا کہ ''الغرفة'' سے مراد ہے ''الجنة'' حافظ ابن کثیرؒ نے بعض ماہرینِ فن کے حوالے سے بتایا ہے کہ جنت کو غرفہ اس کی بلندی (ارتفاع) کے سبب کہا گیا۔ حضرت ابن مسعودؓ کی قراءت ''الجنة'' معنوی تشریح و تعبیر ہے۔یہی صورت آخری آیت کریمہ: ۷۷ میں '' فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ یَكُوْنُ لِزَاماً '' (اور تم نے تکذیب کر لی پس عنقریب وہ

مصیبت بنے گی) کا مفہوم و معنٰی بتاتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ و ابن الزبیرؓ تین تین بزرگوں نے بتایا کہ تکذیب کرنے والوں سے مراد کافرین ہیں، لہذا انھوں نے تشریحی وتفسیری جملہ لکھا: '' فقد كذب الكافرون '' تا کہ اس فعلِ تخاطب (جمع حاضر ماضی) سے کہیں کوئی عاقل مسلمانوں کو مراد نہ لے لے۔ یہاں یہ دلچسپ حقیقت بھی موجود ہے کہ یہ معنٰی/ قراءت کرنے والے ایک حضرت عبد اللہ بن الزبیرؓ بھی تھے جو مصاحفِ عثمانی کے مرتبین، کاتبین اور ناسخین (لکھنے والوں) میں شامل تھے۔ وہ بھی قراءت مختلف کرتے؟

تلفظ کا مسئلہ

قرآن مجید کے تنزیلی الفاظ وکلمات میں بعض کا تلفظ- صحیح تلفظ- ادا کرنا مشکل ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے وہ قریش کے بعض افراد وطبقات کے لیے بھی ممکن تھا اور غیر قریشی افراد وطبقات کے لیے بھی۔ اس میں لسانی گرہ کا معاملہ ہے۔ ذاتی دقت کے علاوہ بعض علاقوں میں ایک حرف یا لفظ کا تلفظ کسی لسانی دقت/ گرہ کے سبب مختلف ہوجاتا ہے۔ یہ عرب قبائل یا عربوں کا ہی مسئلہ نہیں تھا، بلکہ تمام زبانوں کے بولنے والوں کا ہوسکتا تھا اور ہوتا ہے۔ عربی الٰہی قرآن کریم میں عجمی تلفظ بڑی رنگا رنگی دکھا سکتا ہے اور بسا اوقات گل کھلاتا ہے۔ ایک عرب کے لیے عجمی تلفظ لفظ کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔

مشہور ہے کہ عرب '' ضاد'' والی قوم ہیں، یعنی حرف ضاد (ض) کو صحیح مخرج سے ادا کرنے پر صرف وہی قادر ہیں۔ دوسری اقوام اور ان کے افراد الا ماشاء اللہ بالعموم حرف ''ض'' کو اس کے صحیح مخرج سے نہیں نکال سکتے کہ ان کی زبان اس کے لیے نہیں بنی، اسی طرح قریب آواز رکھنے والے الفاظ: ث، س، ص اور ذ، ز، ظ،ض، اور ت، ط اور ح، ہ، وغیرہ کے تلفظ کا فرق روا رکھنا سب کے لیے ممکن نہیں، صرف فنِ تجوید سے واقف اور اس کے ماہر ہی ان کو صحیح تلفظ سے ادا کرسکتے ہیں۔ بعض حروف کا تلفظ مختلف

علاقوں، قبیلوں اور زمروں کے لوگ بعض اوقات الگ کر دیتے ہیں جو ان کی حلق و زبان کی تربیت پر مبنی ہوتا ہے، جیسے گذر چکا کہ قبیلۂ ہذیل کے لوگ ''حتی'' کو ''عتی'' ادا کرتے تھے۔ یہاں یہ دلیل نہیں دی جاسکتی کہ وہ ح سے حتـــی پڑھنے پر قادر نہ تھے، کیوں کہ جو مثال دی جاتی ہے وہ ''حتـــی حیـن'' ہے اور دونوں لفظوں کا آغاز ''ح'' حروف سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ''عتـی عین'' پڑھتے نہ کہ ''عتـی حین''۔ ثابت ہوا کہ وہ ''حتی'' کی جگہ ''عتی'' ہی استعمال کرتے تھے جیسے ہمارے حیدرآبادی اہل زبان بھی ق کا تلفظ خ سے اور پنجابی صاحبانِ علم ''ک'' سے کرتے ہیں۔ یہ ان کی لسانی مجبوری ہے مگر ہذیل کے ساتھ وہ نہ تھی، لہٰذا یہ اجازت ضرور ہی دی گئی تھی کہ وہ اپنے تلفظ کے ساتھ، جیسا بھی وہ ہے، قرآن کریم کی قراءت و تلاوت کریں۔ لیکن اس پر بھی قدغن تھی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن مسعودؓ کے ''عتـــی حیـن'' پڑھنے پر ان کو تاکید کی تھی کہ وہ حتی حین پڑھیں اور پڑھایا کریں کہ وہ لغتِ قرآن ہے۔[۱۴]

در اصل یہ معاملہ ہے بعض حروف کے بعض حروف سے تبدیل کرنے کی عادت و طریقۂ عرب کا۔ وہ بعض حروف کو بعض سے قابلِ تبدیلی مانتے تھے جیسے ''س'' کو ''ص'' سے یا اس کے برعکس۔ قرآن مجید میں ''صـراط'' کے نیچے بسا اوقات چھوٹا سا ''س'' لکھا ہوتا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ سـراط یعنی س سے بھی لکھا جاسکتا ہے اور بعض اہل علم کے نزدیک سـراط ہی زیادہ فصیح ہے۔ قریش البتہ اسے صـراط (ص سے) سے ہی فصیح مانتے تھے۔ اسی طرح لفظ ''مسیطر'' ''مصیطر'' بھی ہے اور دونوں الگ الگ ماہرینِ لغت کے نزدیک فصیح تر اور صحیح تر ہیں۔ علمائے لغت کے خیال میں بعض حروف دوسرے حروف سے تبدیل ہوجاتے ہیں۔ ان میں ''س'' اور ''ص'' بھی ہیں اور دوسرے قریب التلفظ حروف بھی۔ سورہ الغاشیہ کی آیت کریمہ ۲۲: **لست علیهم بمصیطر** (تو نہیں ان پر داروغہ) کے آخری لفظ پر چھوٹا سا 'س' (**بمصۜیطر**) لکھا ہوا ہے، وہ اس بات کی علامت ہے کہ بعض علماء قرآن کے نزدیک اس کا فصیح املا ''س'' سے ہے یعنی ''بمسیطر''۔ اسی طرح ادغام کا مسئلہ ہے کہ دو قریب الصوت

حروف میں ادغام کر کے تلفظ صرف ایک ہی حرف کا کیا جاتا ہے۔ جیسے سورہ یوسف۔ ۴۵ میں وادَّکَـرَ ہے۔ علامہ زرکشیؒ نے متعدد مثالیں ادغام کی دی ہیں اور بعض حروف کے بعض سے تبدیل کیے جانے کی روایت کا ذکر کیا ہے جیسے بسطۃ اور بصطۃ (البقرہ: ۲۴۷، الاعراف: ۶۹) یبسط اور یبصط (الرعد۔ ۲۶، البقرۃ: ۲۴) یُسِرّون اور یُصِرُّوْنَ (ہود: ۵، ۲۰، ۳۸، واقعۃ: ۴۶) یُسْحَبُوْنَ اور یُصْحَبُوْنَ (قمر۔ ۴۸، انبیاء۔ ۴۳) وغیرہ۔ ۱۵ لیکن ان مثالوں میں معانی بھی بدل جاتے ہیں۔

اس پوری بحث میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کلامِ الٰہی کے الفاظ و حروف میں کسی قسم کی تبدیلی کی اجازت نہ تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیم و قراءت میں جو الفاظ و حروف اور کلمات و تعبیرات آئی تھیں وہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ تھیں۔ کسی شخص یا طبقہ کو اس بات کا حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنی طرف سے اپنی خواہش کی بنا پر، آسانی کی خاطر کسی قسم کی تبدیلی کر سکے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس کی بہت عمدہ اور بہت صاف وضاحت کی ہے جس کا نقل کرنا یہاں چشم کشا بھی ہوگا اور بصیرت وا بھی۔ انھوں نے لکھا ہے:

وتتمة ذلک ان یقال: ان الإباحة المذکورة لم تقع بالتشهی، ای ان کل أحد یغیّر الکلمة بمرادفها فی لغته، بل المراعی فی ذلک السماع من النبی ﷺ، ویشیر الی ذلک قول کل من عمرو هشام فی حدیث الباب: أقرأنی النبی ﷺ. ۱۶

بطورِ خلاصہ یہ کہا جائے گا کہ مذکورہ اباحت خواہش پر مبنی نہیں ہے کہ ہر ایک کو اجازت ہو کہ کسی لفظ کو بدل کر اپنی زبان کے کسی دوسرے مترادف لفظ کو استعمال کر لے، بلکہ اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ نبی ﷺ سے اس کی سماعت کی ہو، اس کا اشارہ زیرِ بحث حدیث میں حضرت عمرؓ اور حضرت ہشامؓ دونوں کی اس بات سے ہوتا ہے کہ مجھے نبی ﷺ نے ہی پڑھایا ہے۔

اختلافِ قراءت سے متعلق تمام بحثوں کا حاصل یہی ہے کہ:

۱۔ رسولِ اکرم ﷺ سے جو قراءت یا اختلافِ قراءت ثقہ طریقہ پر منقول ہو وہی قابلِ قبول ہے۔

۲۔ مترادفات یا کلمات کو اپنی طرف سے بڑھانے یا لانے کی کوئی روایت آپ ﷺ سے مروی نہیں۔

۳۔ تمام مرادف الفاظ وکلمات اور دوسری تعبیرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر و تشریح کے ذیل میں آتی ہیں، وہ قراءت قرآن نہیں ہیں۔

۴۔ اعراب اور بعض حروف کی جو کمی بیشی حدیثِ نبوی میں آتی ہے وہ اختلافِ قراءت کے بطور قبول کی جاسکتی ہے۔

۵۔ تمام اختلافاتِ قراءات کا مصحفِ عثمانی کے رسم الخط کے اندر ہونا لازمی ہے، کیوں کہ وہی منزل من اللہ ہے۔

۶۔ تلفظ کا اختلاف لسانی مجبوری سے ہو تو قابل قبول ہے، محض علاقہ، قبیلہ، محاورہ کی بنا پر اختیاری غیر مقبول ہے۔

۷۔ ابن قتیبہ دینوریؒ جیسے علماء ولغت نے جن اختلافاتِ قراءت کو نقل کیا ہے وہ رسم خط مصحفِ عثمانی کے مخالف ہونے کی صورت میں جائز نہیں ہیں۔

حواشی و مراجع:

۱۔ بحث کے ملاحظہ ہو سعید احمد اکبرآبادی کا مقالہ ''انزل القرآن علی سبعة احرف'' ''نذرِ ذاکر'' دہلی، خاکسار کا مقالہ اسی موضوع پر ''دراساتِ دینیہ، علی گڑھ ۱۹۹۱ء

۲۔ **وقال ابو عبید : لیس المراد ان کل کلمة تقرأ علی سبع لغات، بل اللغات السبع مفرقة فیه، فبعضه بلغة قریش وبعضه بلغة هذیل**، ابن حجر عسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری۔ طبع دارالسلام ریاض ۱۹۹۷ء، ۹/۳۵

۳۔ ابن حجر، فتح الباری، حوالہ سابق کے علاوہ کتاب المصاحف: ۱۳-۱۴، یقول

أهل الكوفة قراءة عبدالله،ويقول أهل البصرة قراءة أبى موسىٰ

۴ لأن لغة هشام بلسان قريش و كذلك عمر، ومع ذلك فقد اختلفت قراء تهما، نبه على ذلك ابن عبد البر، فتح الباری، ۹/۳۴

۵ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، عثمان ذوالنورین، ص: ۳۱۱-۳۱۲

۶ حوالہ سابق، ص۳۱۲ ۷ فتح الباری، ۹/۴۶

۸ فتح الباری،۹/۴۶-۴۸: فهذه ستة و خمسون موضعا ليس فيها من المشهور شئى، فليضف إلىٰ ما ذكرته أوّلاً فتكون جملتها نحوا من مائة وثلاثين موضعاً، والله اعلم

۹ فتح الباری، ۹/ ۴۸-۴۹

۱۰ جلال الدین سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، نوع ۲۲-۲۷،۱/۷۷-۷۹ و مابعد، مطبعۃ حجازی قاہرہ، غیر مورخہ، اردو ترجمہ از محمد حلیم انصاری، لاہور ۱۹۸۲ء نوع ۲۲-۲۷، ۱/ ۲۰۰-۲۲۱، نیز زرکشی، البرہان فی علوم القرآن، داراحیاء الکتب العربیۃ مصر، ۱۹۵۷ء نوع ۲۲، ۱/ ۳۱۸ و مابعد، زرکشی نے قراءات سبعہ پر بہترین کتاب ابوعمرو دانی کی ''التیسیر'' بتائی ہے اور پھر شاطبی کی منظوم 'لامیہ' کو قرار دیا ہے۔

۱۱ زرکشی، ۱/۳۳۴-۳۶۸

۱۲ الاتقان، اردو ترجمہ، ۱/۲۰۲، نیز ۲۱۶-۲۱۷

۱۳ عثمان ذوالنورین، ۳۱۲ ۱۴ فتح الباری، ۹/۳۳

۱۵ البرہان، ۱/۴۲۳-۴۳۰

۱۶ فتح الباری، ۹/۳۳ طبع لبنان، زرکشی، البرھان فی علوم القرآن، ۱/۳۲۲، لأن القراءة سنة مروية عن النبی ﷺ ولا تكون القراءة بغير ما روى عنه

بحث ونظر

قرآن مجید اور تسخیرِ کائنات

ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی

قرآنِ کریم میں کائنات اور اس کے مشمولات سے متعلق تسخیر کا لفظ تقریباً چوبیس آیات میں استعمال ہوا ہے۔ ان تمام آیات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کائنات کا مسخر اللہ تعالیٰ ہے۔ البتہ اس تسخیر کا فائدہ انسان کو پہنچتا ہے۔ اس کے باوجود مسلمان دانش ور قرآن کے حوالے سے تسخیر کا لفظ اس معنٰی میں استعمال کرتے ہیں کہ انسان کائنات کی تسخیر کرے۔ گو لغوی اعتبار سے تسخیر کرنے کی بات انسان کے حق میں جائز ہے، مگر جب اس کو قرآن کی آیات سے مدلل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو مشکل پیدا ہوتی ہے۔ ہماری نظر میں قرآن تسخیر کے حوالے سے یہ نہیں کہتا کہ انسان کائنات کی تسخیر کرے، بلکہ صرف یہ کہتا ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو مسخر کر رکھا ہے، جس کا مقصد انسان کو فائدہ پہنچانا ہے، تاکہ وہ شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزارے۔ ذیل کے مضمون میں ہم تسخیر کے قرآنی مفہوم پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے اور جدید علوم کے حوالے سے بتائیں گے کہ انسان کو تصرف کے بجائے موافقت اور مطابقت سے کام لیتے ہوئے کائنات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

تسخیر کے لغوی معنیٰ:

لغت میں تسخیر کے معنی ہیں: بس میں کرنا، زبردستی کسی خاص کام میں لگا دینا۔ خدمت لینا: سخّره تسخيراً: كلّفه عملاً بلا أجرة (کسی سے بلا اجرت کوئی کام لینا) سَخَّره سِخرِیّاً و سُخرِیّاً: كلّفه مالا يريد و قهره (کسی سے زبردستی کوئی کام

لینا)[۱] التسخیر : سیاقة الی الغرض المختص قهراً (کسی سے زبردستی کوئی کام لینا)[۲] معلوم ہوا کہ عربی لغت کے اعتبار سے یہ لفظ ہر اس موقع پر استعمال ہوسکتا ہے جہاں یہ بتانا مقصود ہو کہ کوئی ذات کسی دوسری ذات کو بس میں کیے ہوئے ہے، یا اس سے خدمت لے رہی ہے، خواہ خدمت لینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہو یا انسان کی ہو۔ چناں چہ لغوی استعمال کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ بھی مسخّر ہوسکتا ہے اور انسان بھی، مگر قرآن کریم میں صرف ایک آیت ایسی ہے جس میں انسان کو مسخّر کی حیثیت دی جاسکتی ہے (الزخرف۔۳۲) باقی کسی بھی آیت سے انسان کی اس حیثیت کا ثبوت نہیں ملتا۔

قرآنی تناظر:

قرآنِ کریم میں تسخیر کا لفظ تین حیثیتوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسم کی حیثیت سے سُخْرِیاً، مفعول کی حیثیت سے مُسَخَّرات اور فعل کی حیثیت سے سَخَّر اور سَخَّرْنَا۔

(۱) سُخْرِیاً میں انسانوں کے ایک دوسرے سے خدمت لینے کا حوالہ ہے (الزخرف۴۳:۳۲)

(۲) مُسَخَّرات کا لفظ ستاروں اور پرندوں کے لیے استعمال ہوا ہے، کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کے تابعِ فرمان ہیں (الاعراف:۵۴، النحل:۱۲، ۷۹)

(۳) سَخَّر اور سَخَّرْنَا دونوں ملا کر قرآن میں بائیس مرتبہ آئے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق اجرامِ فلکی، وقت یعنی دن رات کے لیے، زمین، کشتیوں، دریاؤں، سمندروں، ہواؤں، پہاڑوں اور شیطانوں کے لیے ہوا ہے۔

اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں تسخیر کا تناظر کافی وسیع ہے اور پوری فطرت کو جامع ہے۔

تسخیر کے اثرات:

تسخیر کے اثرات ہم کو مختلف شکلوں میں نظر آتے ہیں۔ کم از کم آٹھ اثرات کا تذکرہ قرآن کریم میں کیا گیا ہے:

(۱) اجرامِ فلکی کی گردش (الرعد ۔۱۳)

(۲) اجرامِ فلکی کے متعین مدار اور مقام ۳؎

(۳) ہوا طوفانی کیفیت اختیار کر لیتی ہے (الحاقۃ: ۶۔۸)

(۴) پہاڑ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ مل کر اللہ کی تسبیح کرتے ہیں (الانبیاء۔۷۹،ص۔۱۸)

(۵) سمندروں اور دریاؤں میں کشتیاں تیرتی ہیں (ابراہیم: ۳۲۔۳۳، الحج۔ ۶۵، الزخرف: ۱۲۔۱۴)

(۶) انسان دوسرے انسانوں کی خدمت کرتے ہیں (الزخرف ۔۳۲)

(۷) حیوان انسان کی خدمت کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ان کو ذبح کر لیتا ہے (الحج ۔۳۶)

(۸) حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق ہوا چلتی ہے اور شیاطین ان کی خدمت کرتے ہیں (الانبیاء۔۸۱،ص: ۳۶۔۳۸)

مذکورہ آٹھ اثرات میں سے اولین چار اثرات میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں، کیوں کہ انسان نہ تو اجرامِ فلکی کی گردش پر مقتدر ہے اور نہ ان کے مقام و مدار کا تعین اس نے کیا ہے۔ نہ وہ پہاڑ کو تسبیح پر آمادہ کر سکتا ہے اور نہ ہواؤں کی رفتار اور رخ کا تعین کر سکتا ہے۔ رہا حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق ہوا کا چلنا یا شیاطین سے خدمت لینا تو یہ ایک مخصوص معاملہ ہے جو ایک جلیل القدر پیغمبر سے متعلق ہے۔ اس واقعہ کو تمام انسانوں پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک سمندروں اور دریاؤں میں کشتیاں تیرنے کا تعلق ہے تو یہ کام دراصل اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔ کیوں کہ طبیعی قوانین، جن کی وجہ سے کشتیاں تیرتی ہیں، سب کے سب اللہ تعالیٰ کے ہی بنائے ہوئے ہیں۔ انسان تو صرف کشتی بناتا ہے، اس کا تیرانا صرف اللہ کا کام ہے۔ اب انسانوں کا انسانوں اور جانوروں سے خدمت لینا ہی ایک ایسا عمل رہ جاتا ہے جس میں اللہ کی تسخیر کا فائدہ اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ انسان بھی دوسرے انسانوں

اور جانوروں کو مسخر کر لیتا ہے۔ مگر یہاں بھی غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے یہ کہلوالیتا ہے کہ:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقۡرِنِیۡنَ (الزخرف:۱۳)

پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کردیا، ورنہ ہم انھیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔

اس آیت سے جہاں ایک طرف الٰہی تسخیر کا اثر انسانی تصرف کی شکل میں ظاہر ہونا معلوم ہوتا ہے، وہاں اس ادب کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی پاکی بیان کرے اور اس کے آگے اپنی پستی کا احساس اس کے اندر پیدا ہو۔ اللہ کی تسبیح بیان کرنے میں اس حقیقت کی طرف بھی واضح اشارہ ہے کہ انسان یہ نہ سمجھنے لگ جائے کہ اللہ تعالیٰ میں یا اس کی تخلیق میں کوئی ایسی کم زوری ہے جس کی وجہ سے انسان کو اس کی بنائی ہوئی چند چیزوں پر تصرف حاصل ہو جاتا ہے۔

تسخیر کے مقاصد:

تسخیر سے متعلق قرآنی آیات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ تسخیر کے چار مقاصد ہیں:

(۱) تدبیرِ امر:

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بنا کر چھوڑ نہیں دیا، بلکہ وہ برابر اس میں عمل دخل جاری کیے ہوئے ہے اور متواتر تدبیرِ امر کر رہا ہے۔ قرآن کریم میں زمین و آسمان کی تخلیق کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ کے عرش پر جلوہ افروز ہونے کا ذکر اسی طرف نشان دہی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا محض خالق ہی نہیں، بلکہ مدبّر اور فرماں روا بھی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی فرماں روائی اور تدبیر امر سے متعلق بے شمار آیتیں ہیں۔ یہاں ہم آیاتِ تسخیر پر گفتگو کر رہے ہیں۔ چناں چہ تدبیرِ امر سے متعلق ایک آیتِ تسخیر پیش کرتے ہیں:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِی خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِی سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ يُغْشِی الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف:۵۴)

در حقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے۔ جس نے سورج اور چاند اور تارے پیدا کیے۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔خبردار رہو اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔

مذکورہ بالا آیت میں ایک طرف تسخیر اور تدبیرِ امر کے درمیان ربط معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح چاند، سورج اور ستاروں کا خالق صرف اللہ ہے، اسی طرح ان کو مسخر کرنے اور انھیں حکم دینے والا بھی وہی ہے۔

(۲) تعلیم:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس کائنات کو بنا کر ایسے ہی نہیں چھوڑ دیا، اسی طرح انسان کو بنا کر یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے۔ اس نے انسان کو شعور عطا کیا ہے تو اس کی غذا بھی اتاری ہے۔ چناں چہ ایک طرف تو کائنات کو مسخر کیا، تا کہ انسان اس کا مربوط مطالعہ کر سکے اور دوسری طرف پیغمبروں کا سلسلہ قائم کیا، تا کہ اس کی تعلیم، تہذیب اور تادیب ہو سکے۔ پیغمبر جب انسان کو اللہ کے ایک ہونے کی خبر دے اور اس کی صفات بیان کرے تو خود اس کائنات میں انسان کو ایک اللہ کے تصرف اور تدبیر کا اشارہ ملے۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِی جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (النحل:۷۹)

کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں؟ اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے؟ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ (النحل:۱۲)

اس نے تمہاری بھلائی کے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ اور سب تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

کائنات کی تسخیر میں اہلِ ایمان اور اہلِ عقل کے لیے نشانیوں کا تذکرہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو مسخر نہ کر رکھا ہوتا تو اس میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی نشانی ہوتی نہ اہلِ عقل کے لیے۔اور جب کوئی نشانی نہ ہوتی تو انسان کو نہ توحید کا علم حاصل ہوتا، نہ اللہ کی قدرت کا، نہ اس کی ربوبیت کا، اور نہ اس کی رحمت کا۔ تسخیر اس قدر اہم عمل ہے کہ قرآن کی درج ذیل آیت میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ تسخیر کی وجہ سے انسان کو یہ یقین قائم کرنے میں مدد ملتی ہے کہ کسی وقت اللہ سے ملنا ہے اور اس کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (الرعد:۲)

اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقتِ مقرر تک کے لیے چل رہی ہے اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہاہے ۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے، شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔

(۳) منفعت:

قرآن کی آیاتِ تسخیر کا ایک بہت ہی ابھرا ہوا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کل کائنات کو انسان کے فائدے کے لیے مسخر کر رکھا ہے، چوبیس آیاتِ تسخیر میں سے گیارہ آیتیں ایسی ہیں جن میں لہ،لکم،لنا کا صلہ استعمال کر کے یہ احساس دلایا گیا ہے کہ تسخیر کے فائدے انسان کو پہنچتے ہیں ۔ ساتھ ہی بعض آیات میں جذبۂ شکر ابھارنے پر

زور دیا گیا ہے۔ چناں چہ تسخیر کے مقاصد میں انسان کو مادی اور روحانی منفعت پہنچانا شامل ہے۔ مادی منفعت تو ظاہر ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ الزخرف ۔۱۳ (پاک ہے وہ جس نے اس کو ہمارے زیر فرمان کر دیا اور ہم میں طاقت نہ تھی کہ اس کو بس میں کر لیتے) مَا یُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ النحل ۔۷۹ (ان کو خدا ہی تھامے رکھتا ہے) لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ الحج ۔۳۶، الجاثیہ ۔۱۲ (تاکہ تم شکر کرو) وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً لقمان ۔۲۰ (اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں) میں اسی روحانی منفعت کی طرف اشارہ ہے۔

(۴) تعزیر:

قرآن کریم میں ایک مقام پر تسخیر کے ساتھ علی کا صلہ استعمال کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ قومِ عاد پر ہواؤں کو سات راتوں اور آٹھ دن تک مسخر رکھا گیا، جس کے نتیجے میں وہ قوم اپنے گناہوں کی پاداش میں تباہ و برباد ہوگئی (الحاقۃ :۶ ۔۸) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تسخیر کے مقاصد میں سے ایک مقصد تعزیر بھی ہے ۔ قرآن کریم میں اقوامِ عالم کی تاریخی مثالیں ہیں، جن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سرکش اقوام کو انھی چیزوں کے ذریعہ تباہ و برباد بھی کرتا رہا ہے جو ان کے لیے عام حالات میں زندگی کی بقا اور تمدن کے فروغ کا سبب ہوتی ہیں۔ سدومیوں پر پتھروں کی بارش (الاعراف:۸۰ ۔۸۴)، عاد پر طوفانی ہوا (الحاقۃ: ۶ ۔۸)، ثمود پر زبردست زلزلہ (الاعراف: ۷۳ ۔ ۷۹)، فرعون کا سمندر میں غرق ہونا (الاعراف: ۱۳۳ ۔۱۳۶، الشعراء: ۵۲ ۔ ۶۸) اور ابرہہ پر پرندوں کے ذریعہ کنکریوں کی بارش (الفیل) یہ سب تسخیر کے تعزیری استعمالات ہیں، خواہ ان واقعات کے تذکرے میں تسخیر کا لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

مسخّر کون ہے؟:

سَخَّرَ اور سَخَّرْنَا کی ضمیریں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی راجع ہیں ۔ سَخَّرَ

بِــــاَمْـــرِہ (الاعراف۔۵۴، ابراہیم:۳۲۔۳۳، النحل۔۱۲، الحج:۶۵، الجاثیہ۔۱۲) میں اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ کائنات صرف اللہ کے امر کی تابع ہے، کسی اور کے حکم کی تابع نہیں۔ سورج، چاند اور ستاروں کی تسخیر کا ذکر کرنے کے بعد کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (الرعد۔۲، فاطر۔۱۳، الزمر۔۵) اَلَالَـہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ (الاعراف۔۵۴) کہنا اور پرندوں کی تسخیر کے تذکرے کے فوراً بعد مَایُمْسِــکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہ (النحل۔۷۹) پر زور دینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور ان مظاہر فطرت کا مسخر نہیں ہے۔

مفسرین نے بھی بالعموم آیاتِ تسخیر کا مفہوم یہی لیا ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو انسان کے فائدے کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے تسخیر کے پہلو سے اشیائے عالم کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک وہ اشیاء جن سے انسان جس طرح چاہتا ہے فائدہ اٹھاتا ہے۔ دوسرے وہ اشیاء جن سے انسان فائدہ تو اٹھاتا ہے، مگر اپنی مرضی کے مطابق ان کو ڈھال نہیں سکتا ہے اور نہ چلا سکتا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی سورۂ ابراہیم آیات:۳۲۔۳۳ کے حواشی میں رقم طراز ہیں:

> ''یعنی سمندر کے خوفناک لہروں میں ذرا سی کشتی پر سوار ہو کر کہاں سے کہاں پہنچتے ہو اور کس قدر تجارتی یا غیر تجارتی فوائد حاصل کرتے ہو۔ یہ خدا ہی کی قدرت اور حکم سے ہے کہ سمندر کے تھپیڑوں میں ذرا سے ڈونگی کو ہم جدھر چاہتے ہیں، لیے پھرتے ہیں...... ندیوں میں پانی کا آنا اور کہیں سے کہیں پہنچنا گو کشتی کی طرح تمہارے کہنے میں نہیں، تاہم تمہارے کام میں وہ بھی لگی ہوئی ہیں۔ اسی طرح چاند سورج، جو ایک متعین نظام اور ضابطے کے موافق برابر چل رہے ہیں، کبھی تھکے نہیں، نہ رفتار میں فرق پڑتا ہے، یا رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے ٹھہری عادت کے موافق ہمیشہ چلے آتے ہیں۔ یہ سب چیزیں گو اس معنی سے تمہارے قبضے میں نہیں کہ تم جب چاہو اور جدھر چاہو ان کی قدرتی

حرکت و تاثیر کو پھیر دو، تاہم بہت سے تصرفات و تدابیر سے قطع نظر کر کے بھی وہ قدرتی طور پر ہر وقت تمہاری کسی نہ کسی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ تم سوتے ہو، وہ تمہارا کام کرتے ہیں۔ تم چین سے بیٹھتے ہو، وہ تمہارے لیے سرگرداں ہیں''۔[۴]

مولانا مودودیؒ نے بھی تسخیر سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اشیائے عالم کی دو قسمیں کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''کسی چیز کو کسی کے لیے مسخر کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز اس کے تابع کر دی جائے اور اسے اختیار دے دیا جائے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے اور جس طرح چاہے اسے استعمال کرے۔ دوسری یہ کہ اس چیز کو ایسے ضابطے کا پابند کر دیا جائے جس کی بدولت وہ اس شخص کے لیے نافع ہو جائے اور اس کے مفاد کی خدمت کرتی رہے۔ ہوا، پانی، مٹی، آگ، نباتات، معدنیات، مویشی وغیرہ بے شمار چیزیں پہلے معنیٰ میں ہمارے لیے مسخر ہیں اور چاند، سورج وغیرہ دوسرے معنیٰ میں''۔[۵]

مولانا مودودیؒ نے تسخیر کے تصور سے متعلق ایک تنبیہ بھی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''"تمہارے لیے مسخر کیا" کو عام طور پر لوگ غلطی سے "تمہارے تابع کر دیا" کے معنیٰ میں لے لیتے ہیں اور پھر اس مضمون کی آیات سے عجیب عجیب معنیٰ پیدا کرنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو یہاں تک سمجھ بیٹھے کہ ان آیات کی رو سے تسخیرِ سمٰوات وارض انسان کا منتہائے مقصود ہے۔ حالاں کہ ان چیزوں کے مسخر کرنے کا اس کے سوا کچھ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے قانون کا پابند بنا رکھا ہے جس کی بدولت یہ انسان کے لیے نافع ہوگئی ہیں''۔[۶]

اللہ کے بجائے انسان:

دورِ جدید کے وہ مسلمان سائنس داں جو دینی مزاج رکھتے ہیں، قرآن اور سائنس، یا اسلام اور سائنس کے موضوع پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا احساس رکھتے ہیں، اکثر اس زبوں حالی کو سائنس اور ٹکنالوجی میں پیچھے رہ جانے سے متعلق کرتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ جو سائنس و ٹکنالوجی کی اصلاح کے طلب گار نہیں ہیں، صاف کہتے ہیں کہ قرآن کریم ہم کو یہ حکم دیتا ہے کہ ہم اشیائے کائنات کو مسخر کریں، جس کے لیے سائنس کا علم حاصل کرنا لازمی ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو تسخیرِ کائنات کا خواب بھی دیکھتے ہیں اور سائنس کو قرآن اور سنت کے مطابق ڈھالنے کے بھی قائل ہیں۔ اس دوسرے گروہ میں کچھ علمائے دین شامل ہیں۔ اس دوسرے گروہ میں دو سائنس دانوں اور ایک عالمِ دین کے خیالات کا کسی قدر تجزیہ کیا جا رہا ہے جس سے واضح ہو گا کہ ''اللہ مسخرِ کائنات'' سے ''انسان مسخرِ موجودات'' کی طرف کس طرح پیش قدمی کی جاتی ہے۔

تسخیر اور خلافت:

مہدی گلشنی ایک معروف ایرانی ماہرِ طبیعیات ہیں۔ قرآن اور سائنس، اسلام اور سائنس پر انھوں نے بیش قیمت مضامین و کتب کا اضافہ کیا ہے۔ وہ آیاتِ تسخیر کو تصورِ خلافت کے ساتھ جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اللہ نے انسان کو زمین پر خلیفہ اور نائب بنایا ہے۔ اور اس کو بے شمار مواقع عطا کیے ہیں۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو پہچانے اور مواقع سے فائدہ اٹھائے۔ اللہ کے خلیفہ اور اس کی حکمت و قوت کی علامت کے بطور مناسب قوت و حکمت حاصل کرے''۔[۲]

عبدالقادر نے اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ خیال پیش کیا ہے:

''قرآن چاہتا ہے کہ مسلمان انسانیت کی بھلائی کے لیے فطرت
کی قوتوں کو زیر کریں''۔۸

اس سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ موصوف نے سورۂ لقمان آیت ۲۰ کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''جو کچھ زمین و آسمان میں ہے انسان کے قبضۂ قدرت میں دے دیا گیا ہے All that is in heaven and earth has been subjugated to man. اور اس ترجمے سے اس خیال کو تقویت پہنچائی ہے کہ ''علم قوت ہے، اس معنی میں کہ علم کے ذریعہ کوئی بھی شخص نیچر پر حاوی ہوسکتا ہے اور اس کو اپنی خواہش کا غلام بنا سکتا ہے''۔۹

مولانا محمد شہاب الدین ندویؒ نے بھی جدید علوم سے کافی استفادہ کیا ہے اور اسلام اور سائنس کے موضوع پر ضخیم مواد فراہم کیا ہے۔ انھوں نے اردو قارئین کے لیے اس موضوع پر معلومات فراہم کرنے میں بیش قیمت خدمت انجام دیتے ہوئے منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ انھوں نے بھی آیتِ تسخیر کو آیاتِ استخلاف سے جوڑتے ہوئے جدید علوم کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور تکنالوجی کو ''علمِ تسخیر'' کا نام دیا ہے۔ وہ سورۂ ابراہیم آیات ۳۲ تا ۳۴ اور سورۂ جاثیہ آیت ۱۳ کے حوالے سے کہتے ہیں:

''ان تمام آیات میں غور کیجیے۔ ان آیات کا منشا کیا ہے اور یہ حکم
کس کو دیا جا رہا ہے؟ تسخیر اشیاء کس چیز کا نام ہے؟ باطنی نعمتیں
کس طرح وجود میں آتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ حکم ''خلیفۃ الارض''
کو دیا جا رہا ہے کہ وہ علم اسماء کے ''منتر'' اور ''دستِ تسخیر'' کی
قوت سے ''باطنی نعمتوں'' کو منظرِ عام پر لائے''۔۱۰

اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کے نزدیک تسخیر انسان کا عمل ہے۔ پھر یہ تسخیر کوئی بیانِ واقعہ نہیں ہے، بلکہ ایک علم ہے۔ اس طرح کائنات پر اللہ کی گرفت کا تصور انسان کی گرفت سے بدل جاتا ہے اور آیاتِ تسخیر میں اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ اور اشیاء کو آیاتِ الٰہی مانتے ہوئے ظلم و کفرانِ نعمت سے بچنے کی تلقین، اشیائے کائنات کو

مسخر کرنے کے حکم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

مولانا نے اپنے اقتباس پر حاشیہ لگا کر یہ وضاحت کر دی ہے کہ ''اشیائے عالم کا اصل مسخر تو خالقِ کائنات جلّ شانہ ہے، تمام موجودات پر اسی کا حکم اور اسی کی فرماں روئی چل رہی ہے..... مگر چوں کہ انسان بھی صفاتِ خداوندی کا مظہر ہے، اس لیے وہ بھی ایک خاص دائرے میں حاکم و مختار ہے...... لہٰذا موجوداتِ عالم کا اصل مسخر باری تعالیٰ جلّ شانہٗ ہے، مگر مجازاً انسان کو بھی مسخرِ موجودات کہا جا سکتا ہے اور ان دونوں میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے''۔[۱۱] مولانا نے انسان کو مجازاً مسخر کہنے کی توجیہ تو کر دی، مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ قرآن کے بیانِ واقعہ کو حکمِ الٰہی کس بنا پر کہتے ہیں؟ حالاں کہ بیانِ واقعہ بھی اس معنی میں نہیں ہے کہ انسان اشیاء عالم کا مسخر ہے۔

تسلّط و تصرّف کی اصل:

یہ خیال کہ فطرت کا علم حاصل کرنے کے لیے اس کو قبضے میں کرنا، قابو میں لانا اور شکنجے میں کسنا ضروری ہے، دراصل یورپی نشاۃِ ثانیہ کا ثمرہ ہے۔ اس دور میں عیسائیت کا ایک مخصوص مزاج تھا جس کی وجہ سے لوگ دنیا کے ساتھ باغیانہ خیال رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ دنیا اس کو گناہ کی پاداش میں ملی ہے۔ وہ دنیا کو شیطان کی آماجگاہ، خباثت کا مقام اور گندگی کا ٹھکانہ سمجھتے تھے۔ چناں چہ انسان کی خدمت کے لیے اس کو قابو میں کرنا اور گرفت میں لینا ضروری خیال کرتے تھے۔ اس دور میں فطرت اور اس کے مطالعہ سے متعلق تصورات کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) نشاۃ ثانیہ کا دوران تمام علوم کا انکار کرنے کے لحاظ سے معروف ہے جو وحی یا علومِ نقلیہ پر مبنی ہوں۔ عقلیت اور مذہب انسانیت کو بلند مقام دینے میں نشاۃ ثانیہ کا بڑا کردار رہا ہے۔

(۲) اس دور میں اس تصور نے زور پکڑا کہ فطرت کا مطالعہ محض مطالعے کی خاطر نہیں، بلکہ اس پر پوری طرح قابو پانے کے لیے کرنا چاہیے، تاکہ اس کو انسان کی

مادی فلاح کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

(۳) بیکن کی پیش کردہ علمی منہاج ہی حقیقت کو جاننے کا واحد ذریعہ قرار پائی، جس کے مطابق سچائی کا پتا صرف تجربہ اور مشاہدہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

(۴) حادث فطرت Natura Naturans اور جوہر Natura Naturata کے درمیان فرق ختم ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ لوگ جوہر کو بھولنے لگے اور صرف نیچر باقی رہ گئی۔ سرسید کے دور میں بھی فطرت کا نیچری تصور ہی تھا۔

(۵) فطرت پر حکمرانی حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قوت حاصل کی جائے۔ قوت اس دور کی بنیادی ضرورت تھی اور ہر شخص پر بڑی ذمہ داری یہی تھی کہ وہ کسی بھی میدان میں کسی بھی طرح قوت حاصل کرے۔

(۶) اس اصول کا لازمہ یہ تھا کہ اخلاق کا اصول نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ قوی ہمیشہ صحیح مانا جائے اور اسی طرح اس کے طور طریقے بھی درست تسلیم کیے جائیں۔

(۷) اس کا ایک لازمہ یہ نکلا کہ حکمت اور عمل ایک دوسرے سے لاتعلق ہو گئے۔ عمل کو حکمت پر فوقیت حاصل ہو گئی۔

چناں چہ یورپی نشأۃ ثانیہ کے زمانے میں سائنس کے لیے نظریۂ علمی یہ قرار پایا کہ سائنس یعنی علم صرف مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ نیچر پر تصرف اور تسلط حاصل کرنا چاہیے۔ گویا یہ فطرت انسان کے لیے ہم آہنگ نہیں کی گئی ہے، بلکہ بزور قوت اس کو انسانی مقاصد کے لیے ہم آہنگ کرنا ہے۔ یہی وہ نظریۂ علمی ہے جس پر بیسویں صدی میں زبردست تنقید ہوئی ہے۔ مغربی اقوام نے سائنس کے ذریعہ جس طرح فطرت کے خزانوں کو بے دریغ لوٹا کھسوٹا ہے، انسانوں کو زدوکوب کیا ہے اور بے انتہا مہلک ہتھیار ایجاد کر کے پوری انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے اس کی واحد وجہ سائنس کا تسلّطی نظریۂ علمی ہے۔ اور اب اس ظالمانہ اور باغیانہ نظریۂ علمی کو مسلمان علماء و دانشور قرآنی تصورِ تسخیر کی غیر ضروری تعبیرات کر کے عالمِ اسلام میں درآمد کرنا چاہتے ہیں۔ مسلم سائنس داں بالعموم قرآن اور سائنس کے درمیان

کوئی تضاد نہیں پاتے، بلکہ قرآن کو سائنس کے ذریعہ ثابت کرنے کے زعم میں خود سائنس کو قرآن کی میزان پر حق ثابت کرتے ہیں، بسا اوقات ان کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ قرآنی تصورِ تسخیر کو انسانی عمل ثابت کرنے کی کوشش کرنا بھی دراصل اسی سحر زدگی کا نتیجہ ہے۔ وہ لوگ جو تسخیر کو خلافت سے جوڑتے ہیں ان کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آتی کہ انسان صرف زمین میں خلیفہ ہے، آسمانوں میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلاؤں کی تسخیر کا تصور عالمِ اسلام میں پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہمارے ان زعماء کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ انسان بس چاند کی سطح پر قدم رکھ دے اور وہ اعلان کر دیں کہ چاند کی تسخیر ہوگئی۔[۱۲] چاند پر انسان کا قدم رکھنا یقیناً بہت بڑا قدم ہے۔ اس پر حیرت و استعجاب، جوش و ولولہ اور فخر و افتخار کے جذبات کا امڈ آنا تو بجا، لیکن اس کو چاند کی تسخیر کہنا، جب کہ لغوی اعتبار سے بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے، تو یہ کون سا علمی طریقہ ہے کہ قرآن سے اس کا ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی جائے۔

تسخیر اور الٰہی نقشہ:

تسخیر کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو گرفت میں لے رکھا ہے، تاکہ اس کائنات کے مختلف اعمال اس نقشے کے مطابق ہوتے چلے جائیں جس کو خود اللہ تعالیٰ نے مرتب کیا ہے۔ ظاہر ہے اس نقشے میں زندگی کی نمو اور بقا دونوں شامل ہیں۔ چناں چہ تسخیر میں کائنات کی وہ نازک ترین تنظیم بھی شامل ہے جس کی وجہ سے یہ کائنات زندگی کی نمو و بقا کے لیے سازگار بنی رہتی ہے۔ کل جمادی، نباتی اور حیوانی دنیا بغیر انسان کی ذاتی کوشش کے انسان کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتی رہتی ہے۔ یہ فطرت انسانی سہولتوں، مادی و روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے میں سازگار بنانے کے لیے مسخر کی گئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ فطرت کو زندگی اور انسان کی ترقی مدارج کے غیر موافق بنایا گیا ہو، جس کی وجہ سے انسان کو اس پر تسلط جما کر اپنے لیے بالخصوص سازگار بنانے کی کوشش کرنی پڑے۔

اللہ تعالیٰ نے عملِ تسخیر کے ذریعہ کائنات میں نازک ترین تنظیم برپا کررکھی ہے۔ اس کا ہلکا سے تصور قائم کرنے کے لیے ذیل میں کچھ واقعی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

(۱) کشش ثقل کا کانسٹیٹ:

☆اگر زیادہ ہوجائے تو ستارے بہت گرم ہوجائیں اور بہت تیزی سے جل کرراکھ ہوجائیں۔

☆اگر کم ہوجائے تو ستارے اس قدر ٹھنڈے ہوجائیں کہ نیوکلیائی فیوزن کا عمل رک جائے اور بھاری عناصر نہ بن سکیں۔

(۲) الکٹران پروٹان کا تناسب:

☆ اگر کم یا زیادہ ہوجائے تو کیمیاوی عمل کم زور ہوجائے۔

(۳) کائنات کی انٹروپی کا درجہ:

☆اگر زیادہ ہوجائے تو کہکشاں افزا مقامات میں ستارے نہ بن سکیں۔

☆اگر کم ہوجائے تو کہکشاں افزا مقامات ہی نہ بن سکیں۔

(۴) نظامِ شمسی میں سورجوں کی تعداد:

☆اگر ایک سے زیادہ ہوتو مدّ وجزر کا آپسی تعامل سیاروں کے مداروں کو الٹ پلٹ کرر کھ دے۔

☆ اگر ایک سے کم ہوتو گرمی کی کمی کی وجہ سے زندگی کا نشو ونما نہ ہوسکے۔

(۵) مداروں کا جھکاؤ:

☆اگر زیادہ ہوجائے تو سیارے پر درجۂ حرارت کا فرق بہت زیادہ ہوجائے۔

(۶) محوری گردش کا عرصہ:

☆اگر زیادہ ہوجائے تو دن رات کے درجۂ حرارت میں فرق بہت زیادہ ہوجائے۔

☆اگر کم ہو جائے تو ہواؤں کی رفتار بہت زیادہ ہو جائے۔

(۷) کرۂ باد میں آکسیجن:

☆اگر زیادہ ہو جائے تو پودے اور ہائڈروکاربن بہت آسانی سے جلنے لگیں۔

☆اگر کم ہو جائے تو بڑے جان داروں کو سانس لینے میں مشکل ہو۔

(۸) بحر و برّ کا تناسب:

☆اگر کم یا زیادہ ہو جائے تو زندہ چیزوں کا تنوع اور ان کی پیچیدگی محدود ہو جائے۔

مذکورہ بالا فہرست میں سائنس کی بھرپور شہادت ہے کہ اس کائنات کو مسخر کر لیا گیا ہے اور اس کے فوائد اللہ کے نقشے کے مطابق آخر کار انسان کو پہنچتے ہیں۔ اس کائنات کی بہترین، بلکہ صرف ایک یہی تفہیم ممکن ہے۔ وہ یہ کہ کائنات زمان و مکان کے تسلسل Space Time Continuum سے باہر ایک ایسی ذات کا فعل ہے جس نے نقشہ مرتب بھی کیا ہے اور وہی نقشے کو بروئے کار بھی لا رہی ہے۔

تسخیر اور انسان:

تسخیرِ کائنات کے دو پہلو ہیں۔ ایک اللہ کے تعلق سے اور ایک انسان کے تعلق سے۔ کائنات اور اس کی اشیاء کا اللہ کے ساتھ تو یہ تعلق ہے کہ ان کو اللہ نے مسخر کر رکھا ہے۔ انسان کے تعلق سے تسخیر کا یہ پہلو ہے کہ کائنات اور اس کی اشیاء سے انسان کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ فائدہ دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک انسان کی کوشش کے بغیر اور دوسرا اس کی کوشش اور جدوجہد کے نتیجے میں۔

(الف) بغیر کوشش کے فائدہ:

کوشش کے بغیر جن چیزوں سے انسان کو فائدے پہنچتے ہیں ان میں سورج، چاند، ستارے اور دن کا نظام ہے۔ قرآن کریم میں ان چیزوں کی تسخیر سے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ سب مقررہ مداروں میں متحرک ہیں۔ (الرعد۔۱۳، ابراہیم۔۱۴، الانبیاء۔۳۳،

فاطر۔۱۳، یٰس ۔۴۰) ظاہر ہے کہ ان اشیاء کی حرکت انسان کے قبضہ میں نہیں ہے ۔ لیکن اس حرکت کے ساتھ انسان کے بے شمار فوائد متعلق ہیں ۔ انسان ان فوائد کا مطالعہ کر کے اللہ کی نشانیوں کی ایک طویل فہرست تیار کر سکتا ہے۔آج کا انسان فوائد کے مطالعے کا کام اللہ سے بے نیاز ہو کر کر رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ وہ کائنات کو مسخر کر سکتا ہے، بلکہ اس کو مسخر کرنا چاہیے۔ حرکت پذیر چاند، سورج اور ستاروں کے علاوہ بھی زمین و آسمان میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جن کے فائدے انسان کو اس کی کوشش کے بغیر حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ اس ذیل میں آکسیجن، نائٹروجن، اوزون، بارش، جنگلات کے ذریعہ آکسیجن کی پیدائش اور کاربن ڈائی آکسائڈ کا استعمال یعنی ان اہم گیسوں کے دورانیوں کو برقرار رکھنا اور ان کی نسبت کو قائم رکھنا ، اس کے علاوہ سمندروں اور خشکی کے درمیان ایک مخصوص نسبت کی وجہ سے زمین پر مناسب درجۂ حرارت اور نمی کی کیفیت باقی رہنا اور بے شمار ایسے فوائد ہیں جو انسان کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہیں، البتہ انسان اپنی قوتِ تسخیر کے زعمِ باطل میں فطرت کے اس تناسب کو بری طرح بگاڑ رہا ہے۔

(ب) کوشش سے فائدہ:

قرآن کی کچھ آیاتِ تسخیر سے واضح ثبوت ملتا ہے کہ انسان اپنی کوشش سے تسخیر کا فائدہ حاصل کر سکتا ہے، بلکہ اللہ نے کچھ اشیاء کو مسخر ہی اس طرح کر رکھا ہے کہ انسان کوشش کر کے ان اشیاء سے فائدہ اٹھا سکے۔ان آیات میں سمندر، کشتی اور جانوروں کا تذکرہ ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْماً طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا (النحل:۱۴)	وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے، تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنھیں تم پہنا کرتے ہو۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (الجاثیہ:۱۲)

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا، تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار رہو۔

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا وَ جَعَلَ لَکُمْ مِنَ الْفُلْکِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْکَبُوْنَ لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْکُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّکُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (الزخرف:۱۲۔۱۴)

وہی ہے جس نے تمام جوڑے پیدا کیے اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا، تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ ''پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انھیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے''۔

ان آیات کے مطابق سمندر، جانوروں اور کشتی کو اس طرح مسخر کیا گیا ہے کہ انسان کوشش کر کے ان چیزوں سے فائدہ بھی اٹھائے، اللہ کا شکر گزار بھی ہو اور اسی کی طرف پلٹے بھی۔ ان آیات میں جن چیزوں کا تذکرہ ہے اسی قسم کی باقی تمام چیزوں پر بھی قیاساً ان آیات کا اطلاق ہوگا۔ مثلاً انسان کوشش کر کے آگ جلاتا ہے اور بجھا بھی دیتا ہے۔ ہوا میں آکسیجن موجود ہے جس سے وہ بغیر کوشش کے فائدہ حاصل کرتا ہے، مگر اپنی کوشش سے وہ اس کو سلنڈر میں محفوظ کر کے قریب المرگ مریضوں پر استعمال کرتا ہے اور اکثر ان کو مرنے سے بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گیس کی ویلڈنگ میں بھی آکسیجن استعمال کرتا ہے اور اس کے ذریعے لوہے کے موٹے موٹے لٹھے آناً فاناً کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ کشتیاں انسان بناتا ہے۔ اللہ ان کو سطح سمندر پر تیراتا ہے اور انسان کوشش کر کے ان کو دوڑاتا ہے۔ غرض تسخیر کے کچھ فوائد انسان کو کوشش کے بغیر حاصل ہوتے ہیں اور کچھ کوشش کے بعد۔

انسان جب کوشش کے بعد اشیاءِ کائنات کا فائدہ اٹھاتا ہے تو اس کے اندر اپنے علم، کوشش اور قوتِ کار پر اطمینان بھی حاصل ہوتا ہے، مزید جدو جہد کا ولولہ بھی پیدا ہوتا ہے اور اپنی کارکردگی کا مسلسل تجربہ کرتے کرتے، تصرف اور تسلط کے احساس کو تقویت بھی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان مسلسل ایسے میدانوں میں کامیابی حاصل کرتا جا رہا ہے جن کے بارے میں کسی وقت وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ سب کچھ صحیح ہونے کے باوجود قرآن کی آیاتِ تسخیر زور اس بات پر نہیں دیتیں کہ انسان مسخر ہو جائے، بلکہ زور اسی پر رہتا ہے کہ اللہ ہی مسخر ہے، جس کے نتیجے میں انسان اس کائنات سے بھرپور فائدہ اٹھا پاتا ہے اور جس کے لیے اس کو شکر گزار ہونا چاہیے۔

آیاتِ تسخیر میں صلوں کا استعمال:

آیاتِ تسخیر میں مع، لہ، لکم، لنا اور علی کے صلے استعمال ہوئے ہیں۔ مع کے صلے کے ساتھ سورۂ انبیاء آیت ۷۹ اور سورۂ ص آیت ۱۸ میں کہا گیا ہے کہ ''ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر لیا، تاکہ وہ بھی داؤد کے ساتھ صبح وشام اللہ کی تسبیح کریں''۔ اس مفہوم کے ساتھ تسخیر کے یہ معنی نہیں لیے جا سکتے کہ پہاڑوں اور پرندوں کو حضرت داؤد نے مسخر کر رکھا تھا۔ لـــہ کا صلہ سورۂ ص آیات ۳۶ تا ۳۸ میں استعمال ہوا ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ ''ہم نے اس (یعنی سلیمانؑ) کے لیے ہواؤں اور شیاطین کو مسخر کر رکھا تھا''۔ یہ معاملہ اول تو ایک جلیل القدر پیغمبر کا ہے جس کو تمام انسانوں پر جاری نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ حضرت سلیمانؑ کو کچھ قوتیں بطورِ معجزہ عطا ہوئی تھیں، جو کہ عام انسانوں کو حاصل نہیں ہوتیں۔ دوم سورۂ انبیاء کی آیت ۸۱ میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ ''سب کچھ ہم ہی کرنے والے تھے'' اور ''ہم ہی سب کی نگرانی کر رہے تھے'' لکم اور لنا کا صلہ سات آیتوں میں استعمال ہوا ہے، جن میں سے چار آیتوں میں بـــامـــرہ کہہ کر بتا دیا گیا ہے کہ آیات میں مذکور اشیاء اللہ کے حکم کے پابند ہیں۔ پانچویں آیت میں خود انسان کی زبان سے یہ حقیقت بیان کرا دی گئی ہے کہ مذکورہ اشیاء کے ہم مـــقـــرن نہیں ہو سکتے تھے۔ اللہ پاک ہے اور ہم اسی کی طرف پلٹنے والے

ہیں۔ علینا کا صلہ سورۂ الحاقۃ آیات ٦ تا ٨ میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں بتا دیا گیا ہے کہ اللہ نے تیز رفتار ہوا کو سات رات اور آٹھ دن تک قوم عاد کے اوپر مسخر رکھا، جس کے نتیجہ میں وہ تہس نہس ہو کر رہ گئے۔ اس آخری آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ تسخیر اصلاً اللہ تعالیٰ ہی کا عمل ہے۔ اس سے انسان کو بے انتہا فائدے بھی ہوتے ہیں، لیکن اشیاء کائنات پر اقتدار اور تسلّط بہر حال اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، کیوں کہ وہ جب چاہے انہی مفید چیزوں سے انسانوں اور قوموں کو اور آبادیوں کو برباد بھی کر سکتا ہے۔

تسخیر اور قوانینِ فطرت:

اللہ کی تسخیر کی وجہ سے فطرت میں ربط اور انضباط پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اس کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی ہر چیز کو قانون کا پابند پاتے ہیں۔ چناں چہ ہم مطالعۂ فطرت سے قوانینِ فطرت اخذ کر لیتے ہیں۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، جس نے اس فطرت کو مرتب کیا ہے، کسی قانون اور ضابطے کا پابند ہے؟ نہیں، اللہ پر اور اس کے امر پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ البتہ اللہ کے مختلف اوامر کے درمیان ایک تال میل اور ربط وضبط ضرور پایا جاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے تخالف کی حالت میں نہیں ہوتے۔ یہ اللہ کی حکمت ہے جو مادّی کائنات میں واقعات کے درمیان ربط کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہم فطرت کے قوانین اخذ کر پاتے ہیں۔ جس چیز کو ہم قانونِ فطرت کہتے ہیں وہ درحقیقت اللہ کے اوامر کے درمیان پُر حکمت تال میل کا علم ہے۔ یہ تال میل، جو تسخیر کے مقاصد میں سے ایک ہے، فطرت کو انسان کے لیے مفید بنا دیتا ہے اور انسان کو وہ تمام فائدے حاصل ہو جاتے ہیں جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ قوانینِ فطرت کے علم میں اضافہ ہونے کے ساتھ فطرت کی افادیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مگر یہ اضافہ ایک حد تک ہی قائم رہتا ہے، کیوں کہ ہم فطرت کے قوانین کا علم کما حقہ حاصل نہیں کر پاتے۔ چناں چہ اپنے اعمال کو معلوم قوانینِ فطرت کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہونے کے باوجود اس حد تک کامیاب نہیں ہو پاتے جس حد تک مکمل علم رکھنے والا ہو سکتا ہے۔ اس کم علمی کے باوجود جو کچھ علم ہمارے

پاس موجود ہوتا ہے اس کی وجہ سے ہمارا جوش وولولہ ہمیں ایسے عمل کرنے پر ابھارتا ہے جن کی زد فطرت کے ان گوشوں پر پڑتی ہے جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔ چناں چہ اگر ہم ایک لحاظ سے کامیاب ہو رہے ہوتے ہیں تو کسی لحاظ سے لاعلمی کی بنا پر متواتر نقصان اٹھاتے چلے جاتے ہیں، جس کا ہم کو صرف اس وقت احساس ہوتا ہے جب وہ نقصان ہمارے محسوس دائروں یا ہمارے حسّاس آلات کی پکڑ میں آنا شروع ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اعمال کو علومِ فطرت اور قرآنی ہدایت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں اور صرف علمِ فطرت کے جوش میں مسخّر سے مسخِّر بننے کی کوشش نہ کریں۔ انسان دراصل اپنے آپ کو فطرت کے موافق رکھنے پر مجبورِ محض ہے، خواہ وہ فطرت سے، اس میں کوئی تبدیلی کیے بغیر، فائدہ اٹھا رہا ہو، یا کچھ مصنوعی تبدیلیاں کر کے، ہر حال میں وہ اس پر مجبور ہے کہ اپنے عمل کو قوانینِ فطرت کے موافق رکھے۔ یہ موافقت اس کی ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی۔ چناں چہ اصلاً انسان مسخِّر نہیں، بلکہ مسخَّر ہے۔

تسخیری اور تسلّطی نظریۂ علمی میں فرق:

علم کیا ہے؟ اس کے ذرائع کیا ہیں؟ اس کی منہاج کیا ہے؟ اس کی اہمیت، مقصد اور استعمالات کیا ہیں؟ اس طرح کے سوالات اور ان کے جوابات کی تلاش وجستجو نظریۂ علمی Epistemology کی جولان گاہ ہوتی ہے۔ ان سوالات کے جوابات ہی سے اس موضوع کے حدود اربعہ اور شکل وصورت وجود پذیر ہوتی ہے۔

تسخیری نظریۂ علمی کا مکمل احاطہ کرنا اس مضمون کے مقاصد میں شامل نہیں ہے۔ البتہ اس مقالے کی مناسبت سے ہم تسخیری نظریۂ علمی کے دو اہم پہلوؤں پر زور دینے کی اشد ضرورت محسوس کرتے ہیں:

(ا) تسخیری نظریۂ علمی اصلاً توحیدی نظریۂ علمی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی تمام اشیاء کا موجد صرف ایک اللہ الواحد القہار ہے۔ اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے کائنات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جب اس اصول کے پیشِ نظر کائنات کا مطالعہ ہوگا تو خود یہ کائنات توحید کی گواہی دے گی۔ تسخیری نظریۂ علمی کے توحیدی اصول سے

یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے کہ علومِ اشیاء کا استعمال ہدایتِ الٰہی کی روشنی میں کیا جائے۔

(۲) تسخیری نظریۂ علمی میں موافقت کے اصول کو اہمیت حاصل ہے۔ اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ ہم کائنات میں بھی موافقت کی تلاش و جستجو پر زور دیں اور اپنے اعمال کو بھی موافقت کے اصول پر ڈھالیں۔ کائنات کے وہ وظیفے جن میں بظاہر ناموافقت (Chaos) کا منظر محسوس ہوتا ہے اس کو اپنے علم کی کمی پر محمول کریں۔ اس کے علاوہ اپنے علمی زعم میں ایسی مہم جوئی نہ کریں جو اس موافقت کے خلاف ہو۔

تسخیری نظریۂ علمی میں توحید اصل ہے اور موافقت ایک ذمہ داری۔ منفعتیں انعام ہیں اور حاصل اس کا شکر ہے۔

اس کے مقابلے میں تسلّطی نظریۂ علمی، جس کی پرورش مغرب میں ہوئی، اس کا بنیادی اصول علم کے ذریعہ فطرت پر غلبہ حاصل کرنا ہے۔ موافقت کا فطرت میں پایا جانا تسلّطی نظریہ علمی میں بھی مسلم ہے، کیوں کہ موافقت کے تصور کے بغیر یا فطرت میں موافقت نہ ہونے کی صورت میں کسی بھی طرح علم حاصل کرنے کی کوشش کا خیال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس موافقت کی اصل تسلّطی نظریۂ علمی میں محض بے جان فطرت کے درمیان موافقت ہے۔ کسی جان دار علیم، حکیم اور عظیم ہستی کا تصور اس نظریۂ علمی میں یا تو ایک سرے سے پایا ہی نہیں جاتا، یا پھر بہت کم زور ہوتا ہے۔ چناں چہ اس نظریۂ علمی کے پیشِ نظر طبیعی علوم (Physics) کو بنیاد بنا کر تمام مختلف قوتوں کو کسی ایک کائناتی قوت میں ضم کرنے کی کوشش تو ہو سکتی ہے اور یہ تصوّر اصلاً پایا بھی جاتا ہے کہ کوئی عظیم قوت ایسی ضرور ہے جو ہر قوت پر حاوی ہے۔ البتہ اس تصور کو فلسفیانہ وحدت (Philosophical Monism) تو کہا جا سکتا ہے، مگر اسلامی توحید یا مذہبی Monotheism نہیں کہا جا سکتا۔ چناں چہ:

تسلّطی نظریۂ علمی میں غلبہ اصل ہے اور موافقت محض ایک ضرورت۔ منفعتیں استحقاق ہیں اور حاصل اس کا استحصال ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت، ۴/۳۵۴ مادہ سخّر

۲۔ راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، تحقیق وضبط: محمد سید کیلانی، دار المعرفۃ بیروت، ص ۲۲۷

۳۔ حالاں کہ آیاتِ تسخیر میں کسی بھی اجرامِ ساوی کی حرکت کے ساتھ فلک کا تذکرہ موجود نہیں ہے، لیکن قرآن کی دوسری آیتوں سے اس بات کی شہادت مل جاتی ہے کہ اجرامِ ساوی اپنے اپنے فلک میں متحرک ہیں۔ ملاحظہ کیجیے الانبیاء۔۳۳

۴۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، تفسیر بر ترجمہ مولانا محمود حسن، القرآن الکریم وترجمۃ معانیہ وتفسیرہ الی اللغۃ الاردیۃ، طبع سعودی عرب، ص ۳۴۴

۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۴۳۔۱۰۴۵

۶۔ ایضاً ص ۶۶۷

۷۔ Mehdi Golshani, The Holly Quran and Science of Nature, Islamic Propagation Organisation, Tehran (1986) P. 24

۸۔ C. A, Qadir, Philosophy and Science in the Islamic World. London, Routledge, 1988, P. 15

۹۔ Ibid, P.22, Qadir's English words are "knowledge is power in the Sense that it is through knowledge that one can dominate nature and make it subservient to one's will".

۱۰۔ محمد شہاب الدین ندوی، اسلام کی نشأۃ ثانیہ۔ قرآن کی نظر میں، مجلس نشریاتِ اسلام کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۴۔۱۳۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔۱۳۶

۱۲۔ محمد شہاب الدین ندوی، چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں، فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور

سیاست عادلہ
(اسلامی فکر کا مطالعہ)

——— مولانا سلطان احمد اصلاحی

روحانیت، اخلاق، معاشرت اور معیشت کی طرح معاصر دنیا کی سیاست بھی بے حال ہے۔ اسلام انسانیت کے اس دکھ کا بھی مداوا پیش کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج کے دور میں فکر و نظر کی ترقی اور عقل اور تجربہ کی پختگی سے سیاست کے میدان میں بھی کافی اصلاح اور بہتری آئی ہے۔ جمہوریت کا ارتقاء، حکمراں اور عوام کے حقوق کا تعین، سیاست میں عوامی احتساب اور جمہوری ملکوں میں اقتدار کی پر امن منتقلی جیسے اصول و ضوابط اور عملی اقدامات آج کی بہتر سیاست کے قابلِ قدر مظاہر ہیں۔ مسلمان ممالک سمیت دنیا کے جن ملکوں میں اس پہلو سے کمیاں ہیں، اس ترقی کا فائدہ اٹھا کر ان کو اپنی کمیوں کو دور کرنا چاہیے اور پوری فراخ دلی کے ساتھ مطلوبہ اصلاحات کو قبول کرنا چاہیے۔ عقل اور تجربے سے ہر میدان کی طرح سیاست کے میدان میں بھی جو ترقی ہو اور اس کی جو جزئیات ترتیب پائیں وہ اگر اسلامی شریعت سے نہ ٹکرائیں تو وہ اسلام کے لیے ناقابل قبول نہ ہوں گی، بلکہ اسی کا ایک حصہ سمجھی جائیں گی اور پوری خوش دلی کے ساتھ ان کا استقبال کیا جائے گا۔ معاصر دنیائے سیاست کی ان بہت ساری خوبیوں کے اعتراف کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی کمیوں اور خرابیوں کا پلڑا اس کی اچھائیوں پر بھاری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی آخری رہنمائی کے نور سے جب تک یہ منور نہیں ہوتی اپنی کمزوریوں اور خامیوں سے بھی اس کو رستگاری نصیب نہیں ہو سکتی ہے۔ اسلام اسی آخری خدائی رہنمائی کا دوسرا نام ہے۔ دیکھنا ہے کہ دورِ حاضر کی سیاست کو سنوارنے اور نکھارنے میں وہ کیا کردار ادا کرتا ہے۔

امیر و مامور کا اعتماد:

موجودہ دور کو اگر عقیدے کا بحران (Crisis of faith) کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ بحران زندگی کے ہر حصے میں ہے۔ لیکن دور حاضر کی سیاست اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہے۔ چناں چہ جمہوریت کی ترقی اور اس کے بہت سارے مثبت پہلوؤں کے باوجود آج حکم راں اور عوام کے درمیان اعتماد اور عقیدت کی غیر معمولی طور پر کمی پائی جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کے بجائے انھیں شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ محبت اور خلوص کے بجائے ان کے درمیان نفرت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ باہم ہم دردی و بہی خواہی کے بجائے وہ ایک دوسرے کی بد خواہی میں مصروف اور اس کو نیچا دکھانے اور زک پہنچانے کے درپے نظر آتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس صورت حال کے لیے کسی فریق کو ذمہ دار قرار دے دیا جائے اور سارا الزام صرف حکم راں طبقہ کے سر تھوپا جائے۔ اس کے بجائے حقیقت یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری یکساں طور پر عوام اور حکم رانوں اور امراء و مامورین دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ حالاں کہ بے اعتمادی اور بدگمانی کا یہ مرض اگر کسی چھوٹے سے گھر اور معمولی ادارے اور تنظیم میں پیدا ہو جائے تو یہ اس کے لیے سمِ قاتل ہوتا ہے۔ اس سے اس کی ترقی رکتی اور اس کے نظام کی تمام چولیں ہل جاتی ہیں۔ پھر اگر یہ مرض آج کے دور کے حکومت کے طاقت ور ترین، وسیع ترین اور عظیم ترین ادارے کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کی تباہ کاریوں اور اس کی لائی ہوئی آفتوں کا تصور آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام فرد، خاندان اور معاشرے کو عقیدے اور اعتماد کے اس بحران سے نجات دینے کے ساتھ، حکومت اور سیاست کو بھی اس سے نکالتا ہے۔ اس کے لیے وہ حکم راں اور عوام میں ہر ایک کے اندر مخصوص اوصاف کی آب یاری کرتا ہے جس کی وجہ سے دونوں کی راہ آسان ہوتی اور منزل تک پہنچنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی ہے۔

اسلام میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے۔ اس کے نزدیک حکم راں اور عوام کا

تعلق نفع و خیر خواہی کا ہوتا ہے۔ چناں چہ ہر زمانے میں اللہ کی طرف سے قوم کے جو پیغمبر مبعوث ہوتے رہے ہیں وہی اس کے حاکم اور مطاع اور آج کی اصطلاح میں امیر اور رہبر رہے ہیں۔ سورۂ اعراف میں حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت شعیب علیہ السلام تک پوری انبیائی کہکشاں نے اپنی قوم کے سامنے اپنی یہی حیثیت پیش کی کہ وہ اس کے خیر خواہ اور اس کا دل سے بھلا چاہنے والے ہیں:

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ (اعراف:۶۲)

تم تک اپنے رب کا پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔

وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ (اعراف:۹۳)

اور شعیبؑ نے کہا اے میری قوم کے لوگو! میں نے تم تک اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔

اس کی روشنی میں اگر امیر اور حاکم کا یہ منصب ہے کہ وہ اپنے زیرِ نگرانی عوام کا بھلا چاہنے والا ہو تو مامورین اور ماتحتوں کا معاملہ اس سے مختلف نہیں ہے۔ اس کا بیان سورۂ توبہ میں ہے۔ جہاں کم زوروں، مریضوں اور ناداروں کو اس کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ راہ خدا میں ہونے والی جنگ میں شریک نہ ہوں۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا خیر خواہ اور وفادار رہنا ان کے لیے ہر حال میں ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی ان کا شمار اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نکوکاروں 'محسنین' میں ہوسکتا ہے:

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (توبہ:۹۱)

کم زوروں، بیماروں اور نہ ان لوگوں پر جن کے پاس (جنگ میں) خرچ کرنے کے لیے پیسہ نہیں ہے، ان کے لیے حرج نہیں ہے (کہ وہ جہاد میں شریک نہ ہوں) بشرطے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے خیر خواہ رہیں، ایسے خوب کاروں کا مواخذہ نہیں ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

امیر و مامور کے اس باہمی اعتماد کا تذکرہ قرآن میں دیگر مقامات پر بھی ہے۔ سورۂ آل عمران میں آپ ﷺ کے منصب نبوت کے حوالہ سے اس کی تردید ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں اپنے عوام کے لیے آپؐ کے اندر کسی قسم کا کھوٹ اور بدخواہی کا شائبہ ہوسکتا ہے:

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَايُظْلَمُوْنَ. (آیت:١٦١)

کسی نبی کے شایانِ شان نہیں کہ وہ (اپنے پیروکاروں کے تئیں) کھوٹ کو روا رکھے۔ اور جو کوئی کھوٹ کی راہ اپنائے گا وہ قیامت کے دن اپنے کھوٹ کے ساتھ حاضر ہوگا۔ پھر ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان کے ساتھ کوئی کٹوتی نہیں کی جائے گی۔

اس آیت سے پہلے اپنے پیروکاروں کے لیے آپؐ کی غیر معمولی مہر و محبت، نرم خوئی اور عفو و درگذر اور استغفار و مشاورت کا تذکرہ ہے جس سے بڑھ کر باہمی اعتماد اور اپنائیت کا دوسرا ثبوت نہیں ہوسکتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (آل عمران: ١٥٩)

تو (اے پیغمبرؐ) آپ محض اللہ کے احسان کے باعث اپنے پیروکاروں کے لیے نرم خو ہیں، اس کے بجائے اگر آپؐ درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپؐ کے پاس سے چھٹ جاتے، تو آپؐ ان کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ کیجیے (اللہ سے) ان کی معافی طلب کرتے رہیے، معاملات میں ان سے مشورہ کیجیے۔ پھر جب آپ رائے بنالیجیے تو اللہ پر بھروسہ کیجیے (اور آگے بڑھیے)۔ بلاشبہ اللہ بھروسہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

آپؐ کی اسی صفت کا بیان دوسرے مقام پر اس طرح ہے:

لَقَدْ جَاءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَاعَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُ وْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ:١٢٨) لے	تمہارے پاس تمہارے درمیان سے وہ رسول آ گیا ہے جس کے لیے تمہارا نقصان میں پڑنا سخت بھاری ہے اور وہ تمہیں ہر طرح سے فائدہ پہنچانا چاہتا ہے۔ دراصل وہ مسلمانوں کے لیے شفقت ورحمت کا پتلا ہے۔

سورۂ احزاب میں آپؐ کے سلسلے میں اس سے بھی آگے کی بات کہی گئی ہے اور وہ یہ کہ اہل ایمان اور آپ کے متبعین کی بھلائی اور بہتری کا آپؐ کو اتنا لحاظ اور اس کے لیے اتنی فکر مندی ہے جتنی کہ اس کے افراد کی خود اپنے لیے نہیں ہوسکتی ہے۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ (آیت:٦)	نبی کو مسلمانوں کی اس سے زیادہ فکر ہے جتنی کہ ان کو اپنی ہوسکتی ہے اور اس کی بیویاں ان کی ماؤں کے درجے میں ہیں۔

ذخیرۂ حدیث میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ آپؐ نے اپنے اس مرتبہ و مقام کو عملاً ثابت کر دکھایا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہ بن جابرؓ کی روایت ہے کہ اپنے اصحابؓ میں سے کسی کے متعلق آپ کو یہ اطلاع پہنچی کہ انھوں نے اپنی موت کے بعد اپنے غلام کو آزاد کردیا ہے،٢ جب کہ ان کے پاس اس کے علاوہ دوسرا اور کوئی مال نہیں ہے۔ آپؐ نے اپنے کمال شفقت سے ان کے اس فیصلے کو بدلواتے ہوئے اس غلام کو آٹھ سو درہم میں فروخت کردیا اور اس رقم کو ان تک پہنچوا دیا۔٣ اس سلسلے کا دوسرا واقعہ بھی صحیح بخاری ہی میں ہے۔ صحابی رسول حضرت عبد اللہ بن سہلؓ کے قتل کے واقعہ میں ثبوت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے بھائی حویصہؓ، محیصہؓ اور عبد الرحمٰن بن سہلؓ خیبر کے یہود سے دیت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے تو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی طرف سے ان حضرات کو سو اونٹنیوں کی دیت ادا فرمادی۔٤

نبی ﷺ کی احادیث میں اس مضمون کی مزید وضاحت ہے۔ جہاں حکمرانوں اور عوام کو ایک دوسرے کا ہمدرد و بہی خواہ ہونے کی تاکید ہے۔ حکمرانوں کے سلسلے میں

نبی ﷺ کی مشہور حدیث ہے۔صحابیٔ رسولؐ حضرت معقل بن یسارؓ نے حضرت عبید اللہ بن زیاد کو یہ حدیث اس وقت سنائی جب کہ وہ ان کے مرض الموت میں ان کی عیادت کے لیے گئے تھے۔

مامن عبد یسترعیه الله رعیة فلم یحطها بنصحه لم یجدرائحة الجنة ۵	اللہ تعالیٰ جس بندے کو کچھ لوگوں پر حکم راں بنائے اور وہ ہر طرح سے ان کی بھلائی کے لیے مستعد نہ ہو تو اس کو جنت کی خوشبو نصیب نہ ہوگی۔

اسی موقع پر یہ حدیث الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ بھی ہے جس سے اس کے مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

مامن والٍ یلی رعیة من المسلمین فیموت وهو غاشّ لهم الّاحرم الله علیه الجنة ٦	مسلمان عوام کا جو حکم راں ہو اور اس کو اس حال میں موت آئے کہ وہ ان کے ساتھ کھوٹ کرنے والا (اور ان کا بدخواہ) ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے اوپر جنت کو حرام قرار دیدیں گے۔

صحیح مسلم میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے جس سے اس کا مطلب مزید نکھرتا اور واضح ہوتا ہے:

مامن أمیریلی أمر المسلمین ثم لایجهد لهم وینصح الّالم یدخل معهم الجنة ۷	مسلمانوں کے معاملات کا جو ذمہ دار ہو اس کے باوجود وہ ان کے لیے محنت نہ کرے اور ان کا خیر خواہ نہ ہو تو اس کو ان کے ساتھ جنت کا داخلہ نصیب نہیں ہوگا۔

یہ تاکید امراء کے لیے ہے۔ مامورین کا معاملہ اس سے مختلف نہیں ہے۔ ان کو بھی اپنے امیر و خلیفہ کا پوری طرح وفادار رہنا چاہیے اور اس کی اطاعت و پیروی کو دنیوی مفاد کے تابع نہیں بنانا چاہیے کہ مفاد پورا ہو تو وہ اس کی بات مانیں اور مقصد حاصل نہ ہو تو اس کی بے وفائی میں ان کو کوئی تردد نہ ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس

رویے کے خلاف سخت وعید سنائی ہے۔ قیامت کے دن ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی اور اس کی توجہ سے محروم ہوگا، جس سے بڑھ کر کسی دوسری بدنصیبی اور محرومی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

ثلاث لایکلّمهم الله یوم القیامة ولایزکیهم ولهم عذاب الیم...... ورجل بایع اماماً لا یبایعه الالدنیاه، إن اعطاه مایرید وفی له، والّا لم یف له [8]

تین طرح کے لوگ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات کرے گا، نہ ان کو پاک صاف کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا...... انہی میں سے ایک وہ شخص ہے جو کسی امام سے صرف اپنی دنیوی غرض کے لیے 'بیعت' کرے، کہ اس سے اگر اس کو اپنی من پسند چیز مل جائے تب تو اس کا وفادار ہو، ورنہ اس کا وفادار باقی نہیں رہے۔

اسلام کی تعلیمات میں اسی کا دوسرا نام نصیحت اور خیر خواہی ہے، جس کے سلسلے میں مسلمانوں کو عام طور پر ایک دوسرے کا ہمدرد و بہی خواہ ہونے کے ساتھ خاص طور پر اپنے ائمہ اور امراء کے ساتھ بے لوث اور بے غرض رویّہ اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کی غیر معمولی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے آپ ﷺ نے اسے نفس دین سے تعبیر فرمایا ہے:

عن تمیم الداری ان النبی ﷺ قال الدین النصیحة قلنا لمن قال لله ولکتابه ولرسوله ولائمة المسلمین وعامتهم [9]

حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: دین نصح و خیر خواہی کا نام ہے۔ ہم نے پوچھا کس کے لیے؟۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا اللہ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے اور مسلمانوں کے حکمرانوں اور ان کے عوام کے لیے۔

اس حدیث میں 'نصیحت' کا جو لفظ ہے اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ 'نصح

الـرجـل ثـوبــه ' (آدمی نے اپنے کپڑے کی رفو گری کی) سے 'رفو گری' کے معنی میں ہے۔ جس طرح آدمی اپنے کپڑے کی رفو گری کر کے اس کی اصلاح کرتا اور اس کے نقص کو دور کرتا ہے، یہی کام نصیحت گر اپنے نصیحت کردہ کے ساتھ کرتا ہے۔ دوسری توجیہ میں اسے 'نـصـحـت العسل ' سے ماخوذ بتایا گیا ہے۔ آدمی جب شہد سے موم کو الگ کرتا ہے تو اس کے اس عمل کو 'نصیحت' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خالص شہد کے مانند اپنے نصیحت کردہ کی نسبت سے کھوٹ اور ملاوٹ سے پاک بات کہے۔[۱۰] آگے حدیث میں اللہ، اس کی کتاب اور اس کے رسول کے سلسلے میں نصیحت کا مطلب ہے کہ آدمی کا اللہ پر سچا ایمان ہو، پورے خلوص کے ساتھ اس کی کتاب کے ہمہ جہتی تقاضوں کو پورا کرے، اس کے رسول سے اسے دلی محبت ہو اور وہ دل و جان سے ان کی اطاعت اور پیروی کا حق ادا کرے۔ اس کے بعد ائمہ مسلمین اور ان کے عوام کے ساتھ نصیحت کرنے کا تذکرہ ہے۔ اس کے سلسلے میں آج سے چھ سات سو سال قبل کے زمانے کے پس منظر میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے آج کے دور میں اس کی وسعت و جامعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ صحیح مسلم کے شارح امام نوویؒ م ۶۷۶ھ کے الفاظ اس کے متعلق یہ ہیں:

وأما النصيحة لائمة المسلمين فمعاونتهم على الحق وطاعتهم فيـه وأمـرهـم بـه وتـنـبيههـم وتـذكـيـرهـم بـرفـق ولـطف وإعـلامهـم بـمـا غفلوا عنه ولم يـبـلـغهـم مـن حقوق المسلمين وتـرك الخروج عليهم وتالف قلوب الناس لطاعتهم۔[۱۱]	جہاں تک ائمہ مسلمین کے لیے نصح وخیر خواہی کا سوال ہے تو اس کا مطلب ہے حق کے معاملے میں ان کی مدد کرنا، اس کے سلسلے میں ان کی بات ماننا، ان کو اس کا حکم دینا اور نرمی اور ملاطفت سے ان کو اس پر متنبہ کرنا اور اس کی یاددہانی کرانا اور ان کی کوتاہیوں پر ان کو باخبر کرنا اور مسلمانوں کے جو حقوق وہ ادا کرنے سے قاصر رہے ہیں ان سے ان کو آگاہ کرنا، ان کے خلاف بغاوت سے باز رہنا اور لوگوں کو آمادہ کرنا کہ وہ دل سے ان کی اطاعت اور پیروی کا حق ادا کریں۔

آگے اسی سلسلے میں شارح سنن ابوداؤد صاحب معالم السنن امام خطابیؒ (م ۳۸۸ھ) کے حوالہ سے فرماتے ہیں:

قال الخطابی رحمه الله ومن النصيحة لهم الصلاة خلفهم والجهادمعهم وأداء الصدقات اليهم وترك الخروج بالسيف عليهم اذا ظهر منهم حيف أوسوء عشرة و ان لايعزوا بالثناء الكاذب عليهم وأن يدعىٰ لهم بالصلاح. [۱۲]

امام خطابیؒ کہتے ہیں کہ مسلمان حکم رانوں کے ساتھ نصح و خیر خواہی میں یہ سب شامل ہے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھی جائے ، ان کے ساتھ مل کر جہاد کیا جائے ، ان کو زکوٰۃ ادا کی جائے اور ان کی طرف سے ظلم وزیادتی اور بدسلوکی کا مظاہرہ ہوتو بھی ان کے خلاف مسلح بغاوت سے گریز کیا جائے ، اسی طرح ان کی جھوٹی تعریف سے ان کو دھوکے میں مبتلا نہ کیا جائے اور ان کو بھلائی اور بہتری کی راہ دکھائی جاتی رہے۔

اسی طرح عامۃ المسلمین کی نصیحت کی تشریح میں امام نوویؒ کا کہنا ہے:

وأما نصيحة عامة المسلمين وهم من عداولاة الأمر فارشادهم لمصالحهم فی آخرتهم ودنياهم وكف الأذىٰ عنهم فيعلمهم ما يجهلونه من دينهم ويعينهم عليه بالقول والفعل وسترعوراتهم وسدّ خلاتهم ودفع المضارعنهم وجلب المنافع لهم وامرهم بالمعروف ونهيهم عن المنكر برفق وإخلاص والشفقة عليهم وتوقير كبيرهم ورحمة صغير

جہاں تک حکم رانوں کے علاوہ عام مسلمانوں کے ساتھ نصح و خیرخواہی کا سوال ہےتو اس میں یہ سبھی باتیں شامل ہیں۔ان کی دنیا وآخرت کی مصلحتوں کی طرف ان کومتوجہ کرنا اوران کوکسی طرح کی تکلیف پہنچانے سے باز رہنا، چناں چہ آدمی کو چاہیے کہ دین کی جوبات وہ نہ جانتے ہوں وہ ان کو بتائے اوردین پرعمل کرنے کے لیے ان کوزبان اورعمل دونوں سے مدد پہنچائے ، ان کے عیوب کی پردہ پوشی کرے، ان کی کمیوں کو دور کرے، ان کو نقصان سے بچائے اور انھیں فائدہ پہنچائے ، ان کو بھلائی کا حکم دے اور نرمی

هم وتخوّلهم بالموعظة الحسنة وترک غشّهم وحسدهم وان یحب لهم مایحب لنفسه من الخیر ویکره لهم ما یکره لنفسه من المکروه والذب عن أموالهم وأعراضهم وغیر ذٰلک من أحوالهم بالقول والفعل وحثّهم علی التخلّق بجمیع ماذکرناه من أنواع النصیحة وتنشیط هممهم الی الطاعات وقد کان فی السلف رضی الله عنهم من تبلغ بهاالنصیحة الی الاضرار بدنیاه والله اعلم. [۱۳]

اور خلوص کے ساتھ برائی سے روکے۔ ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے، ان کے بڑوں کی عزت کرے اور ان کے چھوٹوں کے ساتھ شفقت رکھے، وقفہ وقفہ سے ان کو بھلی نصیحت کرے اور ان کے ساتھ کھوٹ اور حسد کا معاملہ کرنے سے باز رہے۔ اور جس بھلائی کو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے اسی کو ان کے لیے پسند کرے اور جس برائی کو اپنے لیے ناپسند کرتا ہے ان کے لیے بھی اس کو اسی طرح ناپسند کرے۔ اور ان کے مال اور ان کی عزت و آبرو کو بچانے کی کوشش کرے۔ اس طرح ان کے دیگر احوال میں زبان اور عمل سے ان کا مددگار بنے۔ اسی طرح وہ ان کو آمادہ کرے کہ بھلائی اور خیر خواہی کی ان تمام باتوں کو وہ اپنالیں اور طاعت و بندگی کے لیے ہر وقت اپنے کو کمر بستہ رکھیں۔ سلف صالح میں ایسے لوگ تھے جو اس نصیحت اور خیر خواہی کی وجہ سے بسااوقات اپنی دنیا کا نقصان کر لیتے تھے۔ واللہ اعلم۔

امیر و مامور کی ایک دوسرے کے لیے نصیحت اور خیر خواہی کے سلسلے میں یہ جو کچھ کہا گیا ہے، خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے ایک خطبہ میں ان دونوں باتوں کو بڑی جامعیت کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ رعایا کے ایک حصے کی طرف سے اپنے حکام اور امراء کے سلسلے میں ان تک شکایت پہنچی کہ وہ صحیح ڈھنگ سے کام نہیں کر رہے اور اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک طریقے ادا نہیں کر رہے ہیں، اس پر آپؓ نے عمال کو طلب کیا اور اللہ

تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد یہ بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں حکم راں اور عوام دونوں کے لیے ان کے حقوق وفرائض کی جامع نشان دہی کی گئی ہے۔ آپؓ نے فرمایا:

ایھا النـاس ایتھا الرعیـة ان لنا علیکـم حق النصیحة بالغیب والمعاونة علی الخیر ایتھا الرعاة ان للرعیة علیکم حقاً فاعلموا انه لاشئی أحبّ الی الله ولا أعزّ من حلم إمام ورفقه ولیس جھل أبغض الی الله ولا أغمّ من جھل إمام وخرقه واعلموا أنه من یأخذ بالعافیة فیمن بین ظھریه یرزق العافیة ممن ھو دونه [۱۴]

اے لوگو! اور اے عوام! ہمارا تمہارے اوپر ایک ضروری حق ہے، اور وہ یہ کہ تم پیٹھ پیچھے ہماری خیرخواہی کروگے اور بھلائی کے کاموں میں ہماری مدد کروگے۔ اسی طرح اے حکم رانو! عوام کا بھی تمہارے اوپر ضروری حق ہے۔ جان لو کہ کسی حکم راں کی برد باری اور اس کی نرمی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اللہ کو محبوب اور عزیز ہو، اسی طرح کسی حکم راں کی نادانی اور اس کے چھوہڑپن سے بڑھ کر کوئی نادانی نہیں جو اللہ کو مبغوض اور رنجیدہ کرنے والی ہو۔ اور جان رکھو کہ جو شخص اپنے سامنے کے لوگوں کے ساتھ امن و عافیت کا معاملہ رکھتا ہے تو اپنے پیٹھ پیچھے لوگوں سے اس کو ایسی ہی عافیت اور امن نصیب ہوتا ہے۔

اس کے آئینے میں امیر و مامور کے غیر معمولی اعتماد و تعاون اور ان کے مخلصانہ تعلقات کی پاکیزگی اور شفافیت کی جو تصویر ابھرتی ہے آج کی بے خدا سیاست میں اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ لیکن معاصر دنیا کی سیاست کی اصلاح میں یہ اسلام کے کردار کی ابتداء ہے۔ اس سے آگے وہ نیچے سے اوپر اور جڑ سے لے کر چوٹی تک ایک ایک کرکے اس کی کمیوں اور رخامیوں کو دور کرتا اور اس کو غیر معمولی رفعتوں اور بلندیوں سے ہم کنار کرتا ہے۔

امانت کا تصور:

امیر و مامور کے اس اخلاص و اعتماد کے ساتھ دنیا کی سیاست کی کامیابی اس حقیقت سے وابستہ ہے کہ اس میں امانت کا تصور پیدا ہوجائے۔حکم راں اور عوام ہر ایک کے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح سے بیٹھ جائے کہ سیاست اور اقتدار ایک امانت ہے۔ نظام ملکی کو چلانے کے لیے نیچے سے لے کر اوپر تک اور چھوٹے سے چھوٹے منصب سے لے کر بڑے سے بڑے عہدے تک اگر اپنے حاکم اور سربراہ کو منتخب کرنے کا آدمی کو اختیار حاصل ہے،تو یہ اختیار بھی امانت ہے اور اس امانت کو اس کے مستحق تک پہونچانے کا مطلب ہے کہ کسی بھی عہدے اور منصب کے لیے اسی شخص کا انتخاب کیا جائے جو ہر طرح سے اس کی اہلیت رکھتا ہو اور اس کے اندر متعلقہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی بھرپور صلاحیت پائی جاتی ہو۔میونسپلٹی اور کارپوریشن سے لے کر اسمبلی اور پارلیمنٹ کی ممبری اور وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ تک ہر جگہ اسی 'امانت' کے تصور کو جاری و ساری ہونا چاہیے اور اس کے سلسلے میں ذاتی،گروہی،نسلی اور لسانی ہر طرح کی عصبیت اور جانب داری سے اوپر اٹھ کر خالص اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر امیر اور حاکم کا انتخاب کیا جانا چاہیے۔اس کے بعد ہی دنیا میں عدل و انصاف کے مطابق معاملات کا فیصلہ ہوسکے گا جس کے بغیر عمدہ سیاست اور اچھی حکم رانی کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس پس منظر میں سورۂ نساء کی آیت کریمہ کی تلاوت کیجیے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰىٓ اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا (النساء:۵۸)	بلاشبہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو ان کے مستحقین تک پہنچاؤ اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو، بلا شبہ یہ بہترین نصیحت ہے جو اللہ تم کو کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ بڑا سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر خانۂ کعبہ کی کنجی کی حوالگی کے حوالہ سے تفسیروں میں اس آیت کریمہ کا ایک خاص پسِ منظر بیان کیا گیا ہے، لیکن ہر جگہ اس کی صراحت ہے کہ یہ آیت اس واقعہ کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ یہ دین و دنیا کی امانتوں کے لیے عام ہے۔ چنانچہ امام رازیؒ کے یہاں اس کی تفسیر کی ابتداء ہی اس سے ہے:

أمر المؤمنين في هذه الآيه بأداء الأمانات في جميع الأمور سواء كانت تلك الأمور من باب المذاهب والديانات أو من باب الدنيا والمعاملات ۱۵

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو تمام معاملات میں امانتوں کو (ان کے مستحقین تک) پہنچانے کا حکم دیا ہے، خواہ یہ معاملات مذہب اور اخلاق سے متعلق ہوں یا دنیا اور معاملات سے۔

فتح مکہ کے بعد خانہ کعبہ کی چابی کے حوالگی کے واقعہ کی تفصیل کے بعد 'امانت' کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے امام رازیؒ دوبارہ اس کی وسعت اور عموم کا تذکرہ کرتے ہیں:

اعلم أن نزول هذه الآية عند هذه القصة لايوجب كونها مخصوصة بهذه القضية بل يدخل فيه جميع أنواع الأمانات ۱٦

جاننا چاہیے کہ اس واقعہ کے موقع پر اس آیت کریمہ کے نزول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ اسی معاملے کے ساتھ خاص ہے، بلکہ اس کے اندر دوسری تمام طرح کی امانتیں اسی طرح شامل ہیں۔

امام رازی سے پہلے صاحب کشاف کے یہاں بھی عموم کا بیان ان الفاظ میں ہے:

الخطاب عام لكل أحد في كل أمانة ۱۷

یہ خطاب ہر شخص کے لیے اور ہر طرح کی امانت کے معاملے کے لیے عام ہے۔

دیگر مفسرین کا معاملہ اس سے مختلف نہیں ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

وهو يعمّ جميع الأمانات الواجبة على الناس من حقوق الله عزو جل علىٰ عباده...... ومن حقوق العباد بعضهم علىٰ بعض ١٨	اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اپنے بندوں پر جو حقوق ہیں ان سے متعلق لوگوں پر جو تمام طرح کی امانتیں واجب ہوتی ہیں وہ اس کے اندر شامل ہیں...... اسی طرح بندوں کے ایک دوسرے پر جو حقوق ہوسکتے ہیں وہ بھی اسی طرح اس کے دائرے میں آتے ہیں۔

مفسر ابو العالیہؒ کی اس تفسیر میں بھی اس کا یہی عموم برقرار ہے:

الأمانة ما أمروا به ونهوا عنه ١٩	امانت کا مطلب ہے ہر وہ بات جس کا لوگوں کو حکم دیا گیا ہے یا جس سے ان کو منع کیا گیا ہے۔

حضرت ربیع بن انسؒ کا بھی اس کے سلسلے میں یہی کہنا ہے:

هى من الأمانات فيما بينك و بين الناس ٢٠	تمہارے اور لوگوں کے درمیان جو کسی طرح کی امانت ہوسکتی ہے وہ سب اس میں شامل ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ اوپر کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد پھر فرماتے ہیں:

وهذا من المشهورات أن هذه الآية نزلت فى ذلك وسواء كانت نزلت فى ذلك أولا فحكمها عام. ٢١	یہ بات بہت مشہور ہے کہ یہ آیت کریمہ اس خاص واقعہ کے سلسلے میں نازل ہوئی، تو چاہے وہ اس سلسلے میں نازل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن اس کا حکم عام ہے۔

یہاں تک کہ متاخرین میں صاحب جلالین بھی آیت کے مخصوص شانِ نزول کو پورے اہتمام سے نقل کرنے کے بعد اس صراحت کو ضروری خیال کرتے ہیں:

والآیة وإن وردت علیٰ سبب خاص فعمومها معتبر لقرینة الجمع ۲۲

آیتِ کریمہ کا نزول چاہے کسی خاص سبب کے تحت ہوا ہو لیکن اس کے حکم کے عام ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ اس میں صیغۂ جمع کا استعمال ہوا ہے۔

بلا شبہ اس 'امانت' میں سرفہرست روپیے پیسے اور مال کی نوعیت کی چیزوں کی ادائیگی ہے۔ جس کسی کے پاس ایسی کوئی امانت ہو وہ حسب وعدہ متعلق شخص کو مقرر شرطوں کے مطابق بے کم و کاست اس کے حوالہ کرے، جیسا کہ تفسیر میں اسی اہتمام سے اس کا تذکرہ ہے۔۲۳ اسی طرح خدا اور بندوں کے حوالہ سے اس امانت کی تفصیلات میں بھی کافی وسعت ہے جس پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔۲۴ اس کی روشنی میں حکم رانوں کے انتخاب میں امانت و دیانت کی ہماری اوپر کی تشریح کی پوری گنجائش نکلتی ہے۔ اسی طرح آیتِ کریمہ کے اگلے ٹکڑے، جس میں لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کا حکم ہے، اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کا تعلق امراء اور حکام سے ہے کہ نزاعات کے فیصلے میں ان کا قدم جادۂ انصاف سے نہ ہٹے۔۲۵ لیکن آیت کے عموم سے اس کی پوری گنجائش نکلتی ہے کہ ان دونوں احکام ''اداء امانت اور انصاف کے ساتھ فیصلہ'' کو حکم راں اور عوام دونوں کے لیے یکساں طور پر عام رکھا جائے۔ عوام اپنے حکم رانوں کا کامل امانت داری کے ساتھ انتخاب کریں اور اس کا فیصلہ کرنے میں ذرّہ برابر بے انصافی اور جانب داری میں مبتلا نہ ہوں۔ اسی طرح حکم راں اس طرح منتخب ہوجانے کے بعد اپنے عوام کے سلسلے میں ان کی ہمہ جہتی امانتوں کی ادائیگی میں چوکس ہوں۔ خزانے اور اقتدار کی جو امانت ان کے پاس ہے اپنے عوام کے لیے اس کی تقسیم اور ادائیگی میں معمولی سے معمولی درجے میں خیانت اور بے انصافی کا ارتکاب نہ ہونے دیں۔ سیاست میں اس طرح جب امانت کی روح جاری و ساری ہوجائے گی تو عوام کے لیے اپنے حکم رانوں کی بے لوث اطاعت میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ اور شریعت کے قرارداده دین و دنیا کے دوگونہ مقاصد کی تکمیل کے لیے بلاشبہ ان کی پیروی بالواسطہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی کے مترادف ہوگی۔ چناں چہ آگے ارشاد ہوا:

يَـا يُّهَـا الَّـذِيْـنَ اٰمَنُوا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْـعُـوْاالـرَّسُوْلَ وَاُوْلِى الْاَمْرِ مِـنْـكُـمْ فَـاِنْ تَـنَـازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَـرُدُّوْهُ اِلَـى الـلّٰـهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْـرٌ وَّ اَحْسَـنُ تَـاوِيْلاً (النساء:۵۹)

اے مسلمانو! اللہ کی بات مانو اور رسولؐ کی بات مانو، اسی طرح اپنے میں سے اصحاب امر کی ۔ پھر اگر تمہارا کسی بات میں جھگڑا ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف پلٹاؤ، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو ۔ یہ تمارے لیے زیادہ بہتر اور انجام کار کے لحاظ سے خوب تر ہے ۔

یہ آیتِ کریمہ معاصر دنیا کی سیکولر سیاست کے لیے نشانِ عبرت ہے جس میں سب سے پہلے سیاست کو اطاعتِ الٰہی کا کلمہ پڑھایا گیا ہے ۔ اسلام میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے ۔ اور ایک سچا مسلمان اپنی زندگی کے ہر معاملے کی طرح سیاست میں امرِ رب کا پابند ہوتا ہے ۔ اسی کے بطن سے رسول کی اطاعت جنم لیتی ہے ۔ اور انسان کی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں ان دونوں کے منشا و مراد کی تکمیل وقت کے امیر اور خلیفہ کے ذریعہ ہوتی ہے جس کا درجہ بدرجہ ہر زمانے کے لحاظ سے نیچے سے اوپر تک الگ الگ نظام ہوتا ہے ۔ خلیفۂ وقت اور امیر زمانہ کی توثیق سے اس پورے نظام کی پیروی خلیفہ اور امیر کی پیروی کے مترادف ہوتی ہے ۔ اگلے فقرے میں اسی سے متعلق ایک عملی دشواری کا حل تجویز ہوا ہے جو اسلام کی سیاست عادلہ کو رفعت و بلندی کے اس مقام پر لے جاتا ہے جس کا آج کے دور کی ترقی یافتہ جمہوریتیں بھی خواب دیکھنے سے قاصر ہیں، اور وہ یہ کہ حکومت اور سیاست کے اس نظام میں نیچے سے اوپر تک جس مرحلے میں بھی حکم راں اور عوام، یا عوام اور عوام میں سے جن کے درمیان کوئی اختلاف اور نزاع ہو جائے تو اس کے فیصلے کے لیے براہ راست اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے، اور رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد آپ کی سنت اور طریقے کی طرف رجوع کیا جائے جیسا کہ تفسیر میں ہر جگہ اس موقع پر اس کی صراحت ہے ۔ [۲۶] اس موقع پر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ امیر و مامور کے اختلاف اور نزاع کی صورت میں حکم

صرف قرآن وسنت کو تسلیم کیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ ایسی ہر صورت میں معاملہ غیر جانب دار عدلیہ کی طرف منتقل ہوگا جس پر خلیفۂ وقت اور امیرِ زمانہ کا کوئی دباؤ نہ ہو اور فریادی کو بے لاگ انصاف کی ضمانت حاصل ہو سکے، جیسا کہ اسلام کی صدرِ اول کی تاریخ اس کی روشن مثالوں سے معمور ہے۔ ۲۷ بے لاگ انصاف کی اسی صورت میں سیاست میں 'امانت' کے اسلامی تصور کی تکمیل ہوتی ہے اور بلاشبہ اس تفصیل کے ساتھ امیر کی اطاعت بالواسطہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے مترادف ہوجاتی ہے، جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے:

من أطاعني فقد أطاع الله ومن عصاني فقد عصى الله، ومن أطاع أميري فقد أطاعني ومن عصى أميري فقد عصاني. ۲۸

جس نے میری بات مانی اس نے اللہ کی بات مانی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے امیر کی بات مانی اس نے میری بات مانی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

اسی موقع پر اسلام میں امیر و مامور کے پاکیزہ ترین رشتے کو نمایاں کرنے والی آپؐ کی دوسری حدیث بھی ہے جس سے آخری محمدی شریعت میں سیاست میں امانت کے تصور کی مزید تشریح ہوتی ہے:

ألا كلكم راعٍ وكلكم مسئول عن رعيته فالإمام الذى على الناس راعٍ وهو مسئول عن رعيته، والرجل راعٍ على أهل بيته وهو مسئول عن رعيته، والمرأة راعية على أهل بيت زوجها وولده وهي مسئولة عنهم، وعبد الرجل راعٍ على

سن لو، تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور اپنے ماتحت کے بارے میں جواب دہ ہے۔ تو جو لوگوں کا حکمراں ہے وہ بھی ان کا نگراں ہے اور اپنے ماتحت کے بارے میں جواب دہ ہے۔ اسی طرح مرد اپنے گھر والوں کا نگراں ہے اور اپنے ماتحتوں کے سلسلے میں جواب دہ ہے۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگراں ہے اور ان کی بابت جواب دہ ہے۔ اسی طرح آدمی کا غلام اپنے آقا

مال سیده وهو مسئول عنه، ألاَ فكلّكم راعٍ وكلّكم مسئول عن رعيته . ۲۹

کے مال کا نگراں ہے اور اس کی بابت جواب دہ ہے۔تو سن لوتم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت کے سلسلے میں جواب دہ ہے۔

سیاست میں امانت اور نگرانی کا یہی تصور تھا جس نے خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی رات کی نیندیں اڑا دی تھیں اور ریاست کے سرکاری خزانہ کے سلسلے میں ان کو غیر معمولی طور پر حسّاس بنادیا تھا جس کا ایک ایک واقعہ آج کی بے خدا اور کرپٹ سیاست کے لیے تازیانۂ عبرت کا کام دے سکتا ہے۔ علامہ ابن جوزیؒ کی سیرۃ عمرؓ میں خلیفہ دومؓ کی بیوی حضرت عاتکہؓ کے حوالہ سے آپؓ کا مشہور واقعہ ہے۔آپؓ کے زمانۂ خلافت میں سرکاری خزانے میں بحرین سے بڑی تعداد میں مشک وغیرہ آیا۔حضرت عمرؓ کی خواہش ہوئی کہ اسے کسی اچھا وزن کرنے والی خاتون سے وزن کرا کے مسلمانوں میں تقسیم کیا جائے۔شاید یہ خواہش بھی اسی احتیاط کے پیشِ نظر ہو کہ ایسی نازک چیز کے لیے نازک ہاتھ کا وزن ہی مناسب ہوگا۔ ان کی بیوی عاتکہؓ کی طرف سے اس وضاحت کے باوجود کہ وہ بہت اچھا وزن کرتی ہیں، خلیفہ دوم نے ان سے یہ خدمت لینے سے انکار کردیا۔ عذر یہ تھا کہ وزن کے دوران انگلی میں لگ جانے والے مشک وغیرہ کو کہیں وہ اپنی کان کی لو اور گردن میں مل لیں اور اس طرح خلیفۂ وقت کے حصہ میں اس مال میں سے عام مسلمانوں سے کچھ زیادہ پہنچ جائے۔۳۰ دوسرے موقع پر ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ مالیات کے سلسلے میں غیر معمولی احتیاط برتتے تھے تو اس کے لیے وہ اللہ کے رسول ﷺ کے اس ارشاد کا حوالہ دیتے تھے:

من مات غاشاً لرعيته لم يرح رائحة الجنة ۳۱

جو شخص اپنی رعایا کے ساتھ کھوٹ کرتے ہوئے مرے گا، اسے جنت کی ہوا نصیب نہ ہوگی۔

لیکن یہ چیز جتنی محبوب اور پسندیدہ ہے اس کے تقاضے اتنے ہی مشکل ہیں۔

اپنے محبوب صحابی حضرت ابو ذر غفاریؓ کو خطاب کرتے ہوئے اللہ کے آخری رسول ﷺ نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس کی طرف توجہ دلا دی تھی:

یا أباذر إنّ الإمارة أمانة وهی یوم القیامة خزی وندامة إلاّمن أخذها بحقّها ثم أدّی الذی علیه فیها وأنّٰی لهٗ ذلک یا أباذر. ۳۲؎	اے ابوذرؓ! حکومت کی ذمہ داری امانت ہے اور قیامت کے دن یہ رسوائی اور شرمندگی کا باعث ہوگی۔اس سے صرف وہ شخص محفوظ ہوگا جو اس کو اس کے حق کے ساتھ لے اور اس میں رہتے ہوئے اس کا حق ادا کرے۔اور اے ابوذرؓ! ایسا کر پانا کیا آسان ہے؟۔

سیاست میں اس امانت کے بجائے جب خیانت کا دور دورہ ہوجائے، جیسا کہ ہمارے زمانہ کا یہ وبائی مرض ہے تو یہ خطرے کی گھنٹی ہے۔آپ ؐ کی دوسری حدیث کے مطابق جب معاملاتِ دنیا نااہلوں اور خیانت کاروں کے حوالہ ہوجائیں تو یہ قربِ قیامت کی علامات میں سے ہے:

إذا ضُیّعت الأمانة فانتظر الساعة	جب امانت ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو۔

اس پر سوال کرنے والے نے سوال کیا کہ یہ امانت کس طرح ضائع کی جائے گی؟ اس کی تشریح میں آپ ؐ نے ارشاد فرمایا:

إذا اُسند الأمر الی غیر أهله فانتظر الساعة. ۳۳؎	جب اقتدار نااہلوں کے سپرد ہوجائے تو قیامت کا انتظار کرو۔

اتباعِ ہویٰ سے گریز:

اسی طرح اسلام سیاست کو خواہشِ نفس کے فتنے سے مامون و محفوظ رکھنے کا سامان کرتا ہے۔فلسفے اور نفسیات کی گہرائیوں میں نہ جاتے ہوئے انسان کے اندر ایک

قوت ہے جو اکثر و بیش تر اسے جادۂ حق سے ہٹانے کا سبب بنتی ہے۔ ذہن اور دماغ سے آدمی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ کررہا ہے یا کرنے جارہا ہے وہ غلط ہے اور اسے اس سے باز رہنا چاہیے، لیکن وہی قوت اور داعیہ اس کو بالکل بے بس بنادیتا ہے اور وہ کچھ کرتا اور کر جاتا ہے جس کے ناحق اور نادرست ہونے میں اسے کوئی شبہ اور اشکال نہیں ہوتا ہے۔ انسان کی یہ قوت اور اس کا یہ داعیہ خواہشِ نفس ہے جس کے لیے قرآن 'ہویٰ' کا لفظ استعمال کرتا ہے اور جسے اس کے لغت میں ایک مستقل اصطلاح کی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام اپنے عام ماننے والوں اور پیروکاروں کے ساتھ خاص طور پر حکومت کے ذمہ داروں اور سربراہانِ اجتماعیت کو اس سب سے بڑے مرض سے بچے رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ آخری نبی ﷺ سے قریب سولہ سو سال قبل کے خانوادۂ بنی اسرائیل نے جلیل القدر پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کے حوالہ سے قرآن کا یہ پیغام قیامت تک کے لیے دنیا کے تمام حکم رانوں، حکومت کے سربراہوں، صدورِ مملکت اور وزراءِ اعظم کے لیے عام ہے:

يٰدَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (ص:۲٦)

اے داؤدؑ! بے شک ہم نے آپ کو زمین میں نائب قرار دیا ہے تو آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیجیے اور آپ خواہشِ نفس کی پیروی نہ کیجیے جس سے کہ آپ اللہ کے راستے سے بھٹک جائیں۔ بلا شبہ جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہوگا اس لیے کہ وہ حساب کے دن کو یاد نہیں رکھ سکے۔

یہ آیتِ کریمہ اسلام کے نظامِ سیاست کی اصل و اساس ہے۔ اس کی ابتداء میں ہی اس کی صراحت ہے کہ انسان اس سرزمین میں بالکل آزاد اور خودمختار نہیں ہے۔

وہ اللہ کے نائب کی حیثیت سے محدود اختیارات کا ہی مالک ہے۔ اور اسی دائرے میں اپنی آزادی کے استعمال سے وہ دنیا و آخرت میں کامیابیوں سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کا حکم ہے، جسے دنیا میں حکومت و سیاست کا اول و آخر کہا جاسکتا ہے۔ اسی سے متصل خواہشِ نفس سے بچنے اور دور رہنے کی تاکید اور اس سے متعلق یہ وعید ہے کہ اس کے دام میں گرفتار ہوکر آدمی اللہ کے راستے سے بھٹک جاتا اور بے راہ روی میں بہت دور نکل جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو حق کے ساتھ فیصلہ اور خواہشِ نفس سے گریز میں بڑا قریبی تعلق ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خواہشِ نفس کے آتے ہی حق و انصاف رخصت ہوجاتا ہے۔ جس حکم راں اور بادشاہ کی ذات اس کی خواہشِ نفس کی آماجگاہ بن جائے، وہ ذات کبھی بھی حق و راستی کی جلوہ گاہ نہیں بن سکتی۔ مزید خواہشِ نفس کی اس پیروی میں بڑی وسعت ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ ہر حال میں ذاتی اور انفرادی ہی ہو، بلکہ بہت سی صورتوں میں اس کا محرک گروہی، نسلی، قومی، لسانی، علاقائی اور بین الاقوامی ہوسکتا ہے۔ خواہشِ نفس کا یہ محرک جتنا طاقت ور اور وسیع الجہات ہوگا، اس کا لایا ہوا فساد اور اس کے نتیجے میں برپا ہونے والی زیادتی اور بے انصافی کا دائرہ بھی اسی کے مطابق وسیع سے وسیع تر ہوگا۔ معاصر دنیا کی ملکی اور عالمی سیاست کے منظر نامے پر ایک سرسری نظر ڈال کر ہی اس حقیقت کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ آیتِ کریمہ کے آخری حصہ میں اسی حکم کا لحاظ نہ کرنے والوں کے لیے آخرت کے سخت عذاب کی دھمکی ہے۔ جسے اسلامی سیاست کا اول و آخر نکتہ کہا جاسکتا ہے۔ آج زندگی کے مختلف دائروں میں خرابی اور بگاڑ کے ساتھ سیاست کے میدان میں جو سب سے بڑا فساد اور بگاڑ ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ انسان آخرت کی جواب دہی کے احساس سے عاری ہوگیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو جتنا ہی با اختیار ہے اسی پیمانے پر وہ اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کررہا ہے۔ اور اپنے آخرت کے انجام کو تاریک سے تاریک تر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اس سے آگے ارشاد ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ (صٓ: ۲۷۔۲۸)

اور ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو کفر کے راستے پر گامزن ہیں تو ایسے کافروں کے لیے دوزخ کی تباہی ہے۔ کیا ہم وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ان کو زمین میں فساد برپا کرنے الوں کے مانند کردیں گے۔ یا یہ کہ ہم (اللہ سے) ڈر کر رہنے والوں کو نافرمانوں کے مانند بنادیں گے۔

حق و انصاف کے معاملے میں معاصر دنیا کی سیاست کی آخری اڑان یہ ہے کہ اس کے سلسلے میں ملکی دساتیر اور کچھ عالمی کنونشنوں اور ریزولشوں کا حوالہ دے دیا جائے۔ آیتِ بالا کے حوالہ سے اسلام اس مسئلہ کو آسمان کی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ کہا یہ جارہا ہے کہ خواہشِ نفس کے دباؤ میں حق و انصاف کی پامالی روحِ کائنات کے منافی ہے۔ پیدا کرنے والے نے زمین و آسمان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا، جس کے نتیجے میں یہاں جو جیسے چاہے رہے اور جو چاہے کرے۔ اس کے بجائے اس کائنات کا ایک بامقصد آغاز ہے۔ اسی طرح ایک خاص مقصد کے تحت اس کا انجام ہونا ہے۔ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہر شخص کی جو اچھی اور بری کارکردگی ہوگی تخلیقِ کائنات کی اس مقصدیت کے پیشِ نظر اس کو اس کے مختلف انجام سے دوچار ہونا ہوگا۔ اس کا برعکس خیال اہلِ کفر و شرک کی خام خیالی ہے اور بہت جلد ان کی اس خام خیالی کا پردہ چاک ہوجائے گا۔ آگے اس سلسلے کی آخری نصیحت ہے کہ حکومت اور اقتدار کے نشے سے آزاد ہوکر لوگ کتاب اللہ کی قرار واقعی قدر دانی کریں۔ اس کے بیان کردہ حقائق پر لوگ تھوڑا سا بھی غور کرسکیں تو حقیقت حال ان کے سامنے آجائے اور بے انصافی اور خواہشِ نفس دونوں کی آفات سے وہ اپنے کو بچانے میں کامیاب ہوجائیں۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْآ اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ. (صٓ:۲۹)

یہ کتاب جو ہم نے آپ پر اتاری ہے بڑی برکت والی ہے۔ تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ سمجھ دار لوگ (اس سے) یاد دہانی حاصل کریں۔

پیغمبر اللہ تعالیٰ کے فضلِ خاص سے اپنی خواہشِ نفس کے فتنہ سے مامون کر دیا جاتا ہے۔ لیکن مروّت میں وہ دوسرے کے کہنے میں آ سکتا اور اس کی خواہشِ نفس کا اثر لے سکتا ہے۔ چناں چہ اللہ کے آخری رسول علیہ السلام کو صاف لفظوں میں سمجھا دیا گیا کہ خواہشِ نفس کی بادِ سموم کا کوئی جھونکا آیا نہیں کہ عدل و انصاف کی فصلِ نازک کا جھلس جانا یقینی ہے، ارشاد ہے:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ. (شوریٰ:۱۵)

تو اس لیے (اے نبیؐ) آپ (لوگوں کو) دعوت دیجیے اور جیسا کہ آپ کو حکم دیا جارہا ہے (اپنے راستہ پر) جمے رہیے اور مخالفوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے۔ اور کہہ دیجیے کہ اللہ نے مجھ کو جو عظیم کتاب دی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ ہمارے کام ہمارے کام آئیں گے اور تمہارے کام تمہارے لیے ہوں گے۔ اب ہم کو ایک دوسرے سے بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس آیتِ کریمہ سے اتباعِ ہویٰ کے اس مرض کی بڑھی ہوئی تباہ کاری اور ہلاکت خیزی کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں آدمی وقتی طور پر زیادتی اور بے انصافی کا ہی ارتکاب نہیں کرتا، بلکہ یہ مرض شدت پکڑ جائے تو اس کی وجہ سے آدمی

قرآن اور پیغمبر کا انکار کر سکتا ہے اور توحید کے مقابلے میں کفر اور شرک کو ترجیح دے سکتا ہے۔ جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ایسا ہو چکا ہے اور آج بھی پھیلی ہوئی دنیا میں اس کے بہت بڑے حصے پر اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ سورۂ جاثیہ کی آیاتِ ذیل میں اس مضمون کو کھول دیا گیا ہے، جہاں حیات و کائنات کی اس سب سے بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ بہت سی صورتوں میں یہ خواہشِ نفس آدمی کے لیے خدا کا درجہ اختیار کر لیتی ہے اور صبح سے شام تک وہ اسی کی پرستش میں گرفتار رہتا ہے۔ شرک و کفر کا یہ وہ مرحلہ ہے جس کی سرحدیں صاف الحاد اور انکارِ خدا سے جا ملتی ہیں، جس کے بعد انسان کی بصیرت اور بصارت دونوں پر ہمیشہ کے لیے گم راہی کا قفل چڑھ جاتا ہے اور ہدایت کی تمام راہیں اس کے لیے مسدود ہو جاتی ہیں:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ. (جاثیہ: ۲۳-۲۴)

تم کیا سمجھتے ہو کہ جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود ٹھہرالیا ہے اور اللہ نے جانتے ہوئے اس کی قسمت میں گم راہی لکھ دی ہے اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگادی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے، تو اللہ کے بعد ایسے شخص کو کون راہ دکھا سکتا ہے، تو کیا تم یاد دہانی نہیں حاصل کرتے ہو۔ اور کافروں کا کہنا ہے کہ یہ تو بس ہماری دنیا کی زندگی ہے، ہم ایسے ہی مرتے اور جیتے ہیں اور یہ زمانہ ہی ہے جو ہمارا کام تمام کرتا ہے، لیکن ان کو حقیقت کا کچھ پتہ نہیں ہے، وہ تو بس اندھیرے میں تکا چلاتے ہیں۔

لوگوں کی نظر میں یہ خواہشِ نفس معمولی چیز ہو سکتی ہے، لیکن اللہ کی کتاب کے نزدیک اس سے بڑھ کر انسان اور کائنات کے لیے ہلاکت اور تباہی کو دعوت دینے والی کوئی دوسری چیز نہیں۔ حق بے اثر ہو جائے اور زمین پر لوگوں کی خواہشات کی حکم رانی قائم ہو جائے تو زمین اور اہلِ زمین کو تباہی اور بربادی سے بچانے کا کوئی امکان باقی

نہیں رہتا، لیکن افسوس ہے کہ لوگ اس یاد دہانی سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ . (مومنون:۷۱)

اور اگر حق اہلِ باطل کی خواہشات کا پابند ہوجائے تو زمین و آسمان میں فساد بر پا ہوجائے اور ان کے درمیان جتنے رہنے والے ہیں سب اس کی لپیٹ میں آ جائیں، حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کے پاس ان کی یاددہانی کا سامان لے کر آئے ہیں لیکن وہ اپنی یاددہانی سے منہ موڑتے ہیں۔

حدیث سے بھی خواہشِ نفس کے اس مرض کی یہی برائی سامنے آتی ہے جس سے مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام دائروں کی طرح ان کی حکومت و سیاست کو بھی محفوظ رکھنا ضروری ہے:

وأما المهلكات فهوى متبع وشح مطاع وإعجاب المرء بنفسه و هو أشد هن. [۳۴]

رہیں ہلاک کرنے والی چیزیں تو وہ خواہشِ نفس ہے جس کے پیچھے آدمی بھاگنے لگے اور لالچ اور بخل ہے جس کا آدمی غلام ہوجائے اور خودرائی و خود پسندی ہے جو ان سب میں بڑھ کر ہلاکت خیز ہے۔

(باقی)

حواشی و مراجع

۱ مزید ملاحظہ ہو: انفال: ۶۳، حجر: ۸۸ اور شعراء: ۲۱۵

۲ صدر اول کے پس منظر میں غلاموں اور باندیوں کی مختلف قسموں میں ایسے غلام کو ''مدبّر'' کہا جاتا ہے جو اپنے آقا کے مرنے پر اس کی وصیت کے مطابق اپنے آپ آزاد ہوجاتا ہے۔

۳ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب بیع الامام علی الناس اموالہم وضیاعہم۔

۴ صحیح بخاری، حوالہ سابق، باب کتاب الحاکم الیٰ عمالہ، والقاضی الیٰ أمنائہ

۵ صحیح بخاری، کتاب الأحکام، باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح، صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل......الخ

۶ صحیح بخاری، حوالہ سابق، صحیح مسلم، حوالہ مذکور

۷ صحیح مسلم، حوالہ بالا

۸ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب من بایع رجلا لا یبایعہ الا للدنیا۔

۹ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان انہ لا یدخل الجنۃ الا المومنون الخ۔ یہ ایک جامع حدیث ہے، اس کی تشریح کے لیے ملاحظہ کیجیے، مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب معروف ومنکر، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی،

۱۰ شرح نووی لصحیح مسلم: ۱/ ۱۳۷، طبع جدید، دار الریان للتراث، القاہرہ، طبعہ اولیٰ ۱۴۰۷ھ، ۱۹۸۷ء

۱۱ نووی: ۱/ ۳۸، حوالہ بالا

۱۲ نووی، حوالہ سابق

۱۳ نووی: ۱/ ۳۹، حوالہ مذکور

۱۴ امام غزالی (م ۵۰۵ھ) احیاء علوم الدین: ۳/ ۱۲۷، طبع قدیم، عامرہ شرفیہ، مصر ۱۳۲۶ھ، وبہامشہ کتاب ''عوارف المعارف'' للسہر وردی

۱۵ مفاتیح الغیب: ۳/ ۲۴۶، عامرہ شرفیہ، مصر ۱۳۰۸ھ، طبعہ اولیٰ

۱۶ مفاتیح الغیب: ۳/ ۲۴۷

۱۷ الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/ ۵۳۵، طبع جدید، مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ، مصر، طبعہ اخیرہ ۱۳۹۲ھ، ۱۹۷۲ء، تحقیق روایات: محمد صادق القمحاوی،

۱۸، ۱۹، ۲۰ تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۱۵، مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر ۱۳۵۶ھ، ۱۹۳۷ء۔

۲۱ تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۱۶

۲۲ تفسیر الجلالین/ ۱۱۱، طبع جدید، بیروت

۲۳ جلالین/۱۱۰،۱۱۱۔ مفاتیح الغیب:۳/۲۴۶-۲۴۷

۲۴ تفسیر ابن کثیر:۱/۵۱۵

۲۵ الکشاف عن حقائق التنزیل:۱/۵۳۵

۲۶ ایک حوالہ کے لیے تفسیر ابن کثیر:۱/۵۱۸ جہاں اس نکتے کو بہت کھول کر اور بہت وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

۲۷ ایک نمونہ کے لیے یہودی کے ساتھ ایک جھگڑے میں امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی قاضی شریح کی عدالت میں حاضری۔ حوالہ کے لیے ہماری کتاب: اسلام کا تصور مساوات کی متعلقہ بحث۔

۲۸ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم، صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمھا فی معصیۃ

۲۹ بخاری، حوالہ سابق، صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر......الخ

۳۰ ابن جوزی: سیرۃ عمر بن الخطابؓ، الدار القومیہ، مصر، ص ۱۱۱

۳۱ طبقات ابن سعد، دار مصادر بیروت، ۱۳۷۷ھ، ۱۹۵۷ء، ۳/۲۹۹

۳۲ امام محمد م ۱۸۹ھ: کتاب الآثار/۱۲۸، مطبع اسلامی لاہور، ۱۹۱۸ء، امام ابو یوسف (م۱۸۲ھ) کتاب الآثار/۲۱۳، إحیاء المعارف النعمانیہ، حیدر آباد الدکن الہند، طبعہ اولیٰ ۱۳۵۵ھ، تصحیح وتعلیق: ابوالوفاء۔ نیز ملاحظہ ہو: صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب کراہۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ۔

۳۳ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب رفع الامانۃ۔

۳۴ بیہقی فی شعب الایمان، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الآداب، باب الغضب والکبر، فصل ثالث۔

☆☆☆

ترجمہ و تلخیص

اصحابِ صفّہ اور اشاعتِ اسلام

ــــــــــــ ڈاکٹر حارث سلیمان الضّاری

ترجمہ: پروفیسر مسعود الرحمٰن خان ندوی

صُفّہ

لغت میں صُفّہ سایہ دار چبوترہ یا چھپّر کو کہتے ہیں[۱] اسلامی اصطلاح میں اس کا اطلاق مسجدِ نبوی کے جوار میں اس چبوترہ پر ہوتا ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے ان مہاجر فقراء کے لیے بنایا تھا جن کا مدینہ میں گھر بار تھا نہ دوست یار۔ یہ ایک طرح سے اولین اسلامی مدرسہ کے طلبہ کی قیام گاہ تھی جو سنہ ۱ھ میں شروع ہوا تھا۔ دار قطنیؒ نے کہا ہے کہ مسجد نبوی اس چبوترہ کے آخر میں تھی۔[۲] جب کہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ یہ سایہ دار چبوترہ مسجد نبوی کے آخر میں ان پردیسیوں کے لیے تعمیر کیا گیا تھا جن کا گھر بار تھا نہ کوئی جائے پناہ۔[۳]

اصحابِ صُفّہ

اصحابِ صفہ عرب و عجم کے وہ غریب مہاجر اہلِ ایمان تھے جنھوں نے مادی و معاشرتی ناسازگار حالات کے تحت مسجدِ نبوی میں قلیل یا طویل مدت کے لیے سکونت اختیار کی۔ حضرت ابو ہریرہؓ (جو خود اہلِ صفہ میں سے تھے) نے کہا ہے: ''اصحابِ صفہ اسلام کے مہمان تھے۔ گھر بار، مال و دولت یا کسی فرد کا سہارا نہ تھا، جب رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی صدقہ آتا تو ان کے پاس بھیج دیتے اور خود اس میں سے کچھ تناول نہ فرماتے، ہاں! جب ہدیہ آتا تو خود تناول فرماتے اور اہلِ صفّہ کو بھی اس میں شریک کرتے''۔[۴] ابن سعد نے یزید بن عبد اللہ بن قسیط سے روایت کی ہے کہ ''اہلِ صفہ

رسول اللہﷺ کے وہ صحابہ تھے جن کے پاس گھر نہیں تھے، وہ مسجد نبوی میں سوتے اور سایہ حاصل کرتے، اس کے علاوہ ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا''۔۵ ابو الأسود دؤلی نے حضرت طلحہ بن عمروؓ سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں: ''جب رسول اللہﷺ کے پاس کوئی ایسا شخص آتا جس کا مدینہ میں کوئی جاننے والا ہوتا تو وہ اس کے پاس قیام کرتا، لیکن جس کا کوئی جاننے والا نہ ہوتا تو وہ اصحابِ صفہ کے ساتھ مقیم ہوتا، میں بھی صفہ کا باسی رہا ہوں، وہاں میں نے ایک شخص کی رفاقت اختیار کر لی تھی، اور رسول اللہﷺ ہر روز دو آدمیوں کو ایک مُد کھجور راشن عطا فرماتے تھے''۔۶

ان روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صفہ کوئی یتیم خانہ یا ناکارہ لوگوں کا گھر نہیں تھا، جہاں لوگ صرف ضروریاتِ زندگی کی تلاش میں آ گئے تھے، جیسا کہ بعض بے علم لوگوں کا خیال ہے۔ وہ تو ان لوگوں کا ماویٰ و مسکن تھا جنھوں نے صدیوں سے انسانیت پر شرک و گم راہی کی چھائی ہوئی زندگی سے فرار اختیار کر کے ایمان کی تلاش میں اللہ اور اس کے رسولﷺ کی طرف اس وقت ہجرت کی جب اس کی ہوائیں طیبہ سے چلیں، انھوں نے ایمان کی محبت میں اہل و عیال، مال و دولت اور وطن سب کچھ چھوڑا تو پھر پلٹ کر پیچھے نہ دیکھا، ان کی اس قربانی کی قدر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کا جھنڈا بلند کرنے، اس کا دفاع کرنے، لوگوں کو اس کی دعوت دینے اور سارے عالم میں اس کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے چُن لیا۔

اصحابِ صفہ کی تعداد

مصادر میں اصحابِ صفہ کی کوئی متعین تعداد نہیں ملتی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ان کی تعداد ستر بتائی گئی ہے جن میں سے کسی کے پاس چادر (کامکمل لباس) نہ تھا۔۷ یہ بھی صحیح تعداد معلوم نہیں ہوتی، نیز حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ تعداد سنہ ۷ھ کی ابتداء میں خود اصحابِ صفہ میں شامل ہونے کے بعد کی بتائی ہوگی، اس سے پہلے کی تعداد کا ذکر نہیں ہے جو کسی بھی وجہ سے صفہ چھوڑ چکے تھے۔ بعض مصادر میں

لگ بھگ چار سو کی تعداد کا ذکر کیا جاتا ہے، ظاہر ہے یہ بھی کوئی متعین تعداد نہیں ہے، اس بارے میں حافظ ابو نعیمؒ نے صحیح بات کہی ہے کہ ''اوقات اور احوال کے لحاظ سے اصحابِ صفّہ کی تعداد مختلف ہوتی تھی، کبھی کسی وجہ سے صفہ کے مقیمین صفہ چھوڑ دیتے تھے تو تعداد کم ہو جاتی تھی، کبھی آنے والوں کی زیادتی ہوتی تو تعداد بڑھ جاتی ۔ ۸ حافظ ابن حجرؒ نے بھی کہا ہے کہ علاماتِ نبوت میں حضرت ابو ہریرہؓ کی مذکور ستّر کی تعداد کا مطلب محدود کرنا نہیں، بلکہ یہ تو اس وقت کی تعداد ہے جس وقت کا قصہ ابو ہریرہؓ نے بیان کیا ہے ۔۹

حالاتِ اصحابِ صفّہ

اصحابِ صفّہ پر فقر و ضرورت، لباس کی خرابی اور مظہر کی خستگی کا غلبہ تھا، چناں چہ حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھاتے تو بعض اصحابِ صفّہ فقر و فاقہ کی وجہ سے گر پڑتے، یہاں تک کہ بدو کہنے لگتے کہ یہ پاگل لوگ ہیں، اور حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت گذر چکی ہے کہ اصحابِ صفّہ کے ستّر افراد میں سے کسی کے پاس چادر نہیں تھی، ۱۰ دوسری روایت میں ہے کہ اصحابِ صفّہ کے تیس آدمیوں کو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے میں نے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، ان کے پاس چادریں نہیں تھیں، ایک اور روایت میں ہے کہ تہہ میں (دیکھا) اور میں بھی انھیں میں سے تھا۔۱۱ ابو حازم نے حضرت واثلہ بن اسقعؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: میں اصحابِ صفہ میں تھا، ہم میں سے کسی کے پاس مکمل لباس نہیں تھا، پسینہ نے ہماری کھالوں پر میل اور مٹی کے نشان بنا دیے تھے ۔ حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس اس حال میں آئے کہ ہم کم زور مسلمانوں کو ایک شخص قرآن سنا رہا تھا اور ہمارے لیے دعا کر رہا تھا، میرا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان میں سے کسی کو پہچان نہیں پا رہے تھے، اس لیے کہ وہ اپنے جسموں پر ٹھیک سے کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کر رہے تھے ۔۱۲

اہلِ صفّہ نے فقر و فاقہ پر صبر کر کے اللہ کی عطا کردہ نعمت اسلام کو ترجیح دی، اللہ کی راہ میں اس قربانی پر اسی سے ثواب کی امید رکھی، تاکہ دیگر مسلمان بھائیوں کی طرح شرفِ صحبت سے مستفید ہوں، چناں چہ دنیا و آخرت میں ان کا مقام بلند ہوا اور تاریخ نے ان کی خوش گوار یاد کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا۔

اصحابِ صفّہ کے اسمائے گرامی

بعض علماء نے اصحابِ صفہ کے اسمائے گرامی تلاش کرکے جمع کرنے کی امکانی کوشش کی ہے۔ان میں سے ابوسعید احمد بن محمد ابن الاعرابی (م ۳۴۰ھ) نے اپنی کتاب اصحاب الصفۃ میں، ان کے بعد ابوعبداللہ الحاکم نیسابوری (م ۴۰۵ھ) نے بھی اصحابہ الصفۃ نامی کتاب میں، پھر ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین سُلمی (م ۴۱۲ھ) نے تاریخ اھل الصفۃ میں [۱۳] اصحابِ صفہ کے اسماء گرامی جمع کرنے کا کام کیا۔اس کے بعد ابونعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی (م ۴۳۰ھ) نے ''حلیۃ الأولیاء وطبقات الأصفیاء'' میں سابقین کی کوششوں سے فائدہ اٹھا کر سب اصحابِ صفہ کے اسماء و احوال ایک جگہ مرتب کیے اور جو اسماء رہ گئے تھے ان کا استدراک کیا۔ چناں چہ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: ''اصحابِ صفہ کے اسماء کی طرف ابوسعید بن الاعرابی نے توجہ کی، پھر ابوعبدالرحمٰن سُلمی نے کچھ ناموں کا اضافہ کیا، اس کے بعد ابونعیم نے سب کو یکجا کیا، اور فوت شدہ کا استدراک کیا، اور یہ بھی بتایا کہ بعض لوگوں کو اشتباہ یا غلطی کی وجہ سے اصحابِ صفّہ میں شامل کرلیا گیا ہے، حالاں کہ وہ ان میں سے نہیں ہیں۔ [۱۴] محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی (م ۹۰۲ھ) نے اپنی کتاب رجحان الكفّة في بيان نبذة من أخبار اهل الصفّة میں اصحابِ صفہ کے کچھ حالات کا ذکر کیا۔ انھوں نے ابونعیم کے بیان کردہ اسماء اصحابِ صفّہ کی تجرید کر کے ان کو معجم کے حروف کے مطابق مرتب کیا، لیکن استقصاء نہیں کیا، [۱۵] ان تمام کوششوں کے باوجود ان علماء نے صرف پچاس سے کچھ اوپر اسماء اصحابِ صفّہ ذکر کیے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ ان کی حقیقی تعداد سے بہت کم ہے۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک اصحابِ صفہ کا مقام

اللہ، اس کے رسول ﷺ اور دیگر صحابہ کے نزدیک اصحابِ صفہ کا بڑا مقام تھا، چناں چہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحابہ کی عام تعدیل، ان سے رضا مندی، اچھا وعدہ، جنت میں قیام اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان کی سرپرستی، دیکھ بھال اور تعریف کے علاوہ اصحابِ صفہ کی ایسی صفات بیان کی گئی ہیں جو ان کے فضل اور اعلیٰ درجہ پر دلالت کرتی ہیں، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے رب کی مرضی کے لیے صبح و شام تسبیح وتحمید، دعا اور نماز جیسے اعمال صالحہ ادا کرنے والے کہا ہے:

وَلاَ تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ (الانعام ۵۲)

اپنے رب کی رضا کے لیے جو صبح وشام اس کو پکارتے ہیں ان کو آپ نہ دھتکاریں

یہ آیت اصحابِ صفہ اور دیگر کم زور و فقیر مسلمانوں کے حق میں اتری تھی، چناں چہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مسلمؒ کی روایت ہے کہ: ''ایک موقع پر نبی ﷺ کے ساتھ ہم چھ آدمی تھے، مشرکین نے حضور سے کہا: ان لوگوں کو باہر نکال دیں، تاکہ یہ ہمارے خلاف جرأت نہ کرنے لگیں۔ سعدؓ نے کہا کہ ان چھ افراد میں ایک میں تھا، دوسرے ابن مسعودؓ، تیسرا ایک قبیلۂ ہذیل کا آدمی، چوتھے بلالؓ، نیز دو دیگر لوگ تھے جن کے نام مجھے یاد نہیں۔ مشرکین کے مذکورہ مطالبہ سے رسول اللہ ﷺ کے دل میں کچھ بات آئی، اس وقت اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت اتاری۔ ۱۷؎ ابونعیم کی روایت میں ہے کہ: ''ہم آگے بڑھ بڑھ کر نبی ﷺ کے قریب بیٹھتے تھے، تو مشرکین نے کہا: ہم کو چھوڑ کر آپ ان لوگوں کو اپنے قریب کرتے ہیں، اس پر حضور نے کسی دوسری بات کا ارادہ کیا، تو یہ آیت اتری۔ ۱۸؎ ابن ماجہؒ اور ابونعیمؒ نے اس آیت سے متعلق خباب بن ارتؓ کی روایت بیان کی ہے کہ: ''اقرع بن حابس تمیمی اور عیینہ بن حصن فزاری آئے تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو کم زور مسلمانوں میں سے صہیبؓ، بلالؓ، عمارؓ اور خبابؓ کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا، ان کو حقیر سمجھا، حضور کے پاس آئے اور ان سے خلوت میں

کہا: ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ مجلس کا الگ سے وقت مقرر کر دیں، تا کہ عرب کو ہماری فضیلت (بڑائی) معلوم ہو، اس لیے کہ آپ کے پاس عرب کے وفود آتے ہیں تو ہم کو شرم آتی ہے کہ وہ ہم کو ان غلاموں کے ساتھ دیکھیں، اس لیے جب ہم آئیں تو آپ ان کو مجلس سے اٹھا دیں، پھر جب ہم فارغ ہو جائیں تو اگر آپ چاہیں تو ان کو بٹھالیں، حضور نے فرمایا: ہاں، انھوں نے کہا: یہ بات ہمارے لیے لکھ دیجیے، آپ نے کاغذ منگوایا اور علیؓ کو بلایا تا کہ وہ لکھیں، جب کہ ہم ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے، اس وقت جبرئیلؑ آئے اور مذکورہ آیت سنائی۔ اس موقع پر یہ آیت بھی نازل ہوئی:

وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ	آپ ان لوگوں کے ساتھ اپنے کو روکے
رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ	رکھیے جو اللہ کی رضا کے لیے صبح و شام
وَجْهَهٗ (الکہف ۲۸)	اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

خبابؓ کہتے ہیں: پھر ہم نبی ﷺ کے ساتھ بیٹھتے تھے، اور جب آپ کے اٹھنے کا وقت آتا تو ہم خود اٹھ جاتے تھے کہ آپ جب پسند فرمائیں مجلس سے اٹھ جائیں۔ [۱۹]

اصحابِ صفہ اور دیگر غریب مسلمانوں کے ذکر، عبادت اور اخلاص کی بدولت اللہ نے نبی ﷺ کو امراء کی تالیف قلب کے لیے فقراء کو اپنی مجلس سے عارضی طور پر بھی اٹھانے سے نہ صرف منع فرما دیا، بلکہ ان کے ساتھ صلہ رحمی، مستقل ربط و تعلق اور سرپرستی و اعزاز کا بھی حکم دیا۔ [۲۰] اس الٰہی رہنمائی کے بعد نبی ﷺ نے بے یار و مددگار صحابہ سے اپنا ربط و ضبط اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بڑھا دیا، نیز صحابہ کے اٹھنے سے پہلے آپ خود مجلس سے نہ اٹھتے، تا کہ فرمانِ الٰہی کی تعمیل کے علاوہ ایمان کی راہ میں ہر تنگی و پریشانی برداشت کر کے استقلال کا ثبوت دینے والے جیالے صحابہ کے دل خوش ہوں، چناں چہ مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کی تعریف ہے کہ اس نے میری امت میں ایسے افراد پیدا کیے جن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا مجھے حکم ہوا''۔ [۲۱] ایک روایت میں ہے کہ ایک موقع پر کسی صحابی نے آپؐ سے پوچھا: ''اے رسول اللہ آپؐ نے عیینہ اور اُقرع کو سینکڑوں

عطا فرمائے اور جُعیل بن سراقہ ضمری کو چھوڑ دیا'' تو آپؐ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جُعیل بن سراقہ ساری زمین، تمام موجودات اور عیینہ اور اُقرع جیسے تمام لوگوں سے بہتر ہیں، لیکن میں نے اسلام لانے کے لیے ان دونوں کی تالیف قلب کی ہے، اور جُعیل کو اس کے اسلام کے بھروسہ پر چھوڑ دیا ہے۔٢٢

اصحابِ صفّہ کو نبی ﷺ کی سرپرستی

نبی ﷺ کو اصحابِ صفہ کے امور سے بہت دلچسپی تھی۔ آپ ان کا ایک باپ کے اپنے فرزندوں، ایک استاد کے اپنے ہونہار شاگردوں اور ایک داعی کے اپنے وفادار متبعین کی طرح خیال کرتے اور سرپرستی فرماتے تھے، اس حسنِ سلوک کی وجہ سے ان حضرات کی بہت سی نفسیاتی اور مادی پریشانیاں ہلکی ہوگئی تھیں، چناں چہ آپ ان کی خبر گیری کرتے، بیش تر اوقات ان کے ساتھ گذارتے، اور زیادہ تر حالات، یہاں تک کہ بھوک اور فاقہ میں بھی ان کے ساتھ شریک رہتے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ ایک دن حضرت ابوطلحہؓ آئے، جب کہ نبی ﷺ اصحابِ صفہ کو کھڑے ہوئے پڑھا رہے تھے، اور آپ کے پیٹ پر بھوک کی وجہ سے پتھر کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا تھا، تاکہ کمر سیدھی رکھ سکیں۔٢٣

آپ کی اس سرپرستی کے کئی پہلو تھے، ان میں اہم ترین درج ذیل ہیں:

(الف) علمی سرپرستی:

یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ نبی ﷺ تمام صحابہ کے معلم اوّل تھے۔ دیگر صحابہ کے مقابلہ میں فراغت اور ہر وقت حضور کی رفاقت کی وجہ سے اصحابِ صفہ کو رسول اللہ ﷺ سے تعلیم حاصل کرنے اور ان کی خبر گیری کا زیادہ حصہ ملتا تھا۔ آپ ان کو قرآن وسنت کی تعلیم دیتے، نیز سلوک وعمل سکھاتے، اور مسجد نبوی وصفّہ کے اندر و باہر ایک دوسرے کے ساتھ حسن معاملہ کی ہدایت فرماتے، اور دوگنے اجروثواب کی ترغیب کے ذریعہ تلاوتِ قرآن کی تاکید کرتے۔ حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ

ﷺ ایک دن ہمارے پاس تشریف لائے، جب کہ ہم صفہ میں تھے اور فرمایا: تم میں سے کون چاہتا ہے کہ ہر روز بطحاء اور عقیق جائے اور وہاں سے بغیر کسی گناہ یا قطع رحم کے دو اعلیٰ قسم کی اونٹنیاں لائے؟ ہم نے کہا: اے رسول اللہ! یہ تو ہم میں سے ہر ایک پسند کرتا ہے، آپؐ نے فرمایا: تم میں سے کوئی کیوں مسجد جا کر کچھ نہیں سیکھتا یا کتاب اللہ کی دو آیتیں نہیں پڑھتا کہ یہ اس کے لیے دو، تین اور چار اونٹنیوں یا چار اونٹنیوں کے ساتھ چار اونٹوں کے جوڑوں سے بہتر ہیں۔'' ۲۴ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، اس وقت ایک آدمی ہمیں قرآن پڑھا رہا تھا اور دین کی باتیں سکھا رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ کے ذریعہ اشارہ فرمایا کہ گول حلقہ بنالو۔ چناں چہ حلقہ بن گیا، پھر آپ نے کہا: کیا تم لوگ مذاکرہ کر رہے تھے؟ حاضرین نے کہا: یہ شخص ہمیں قرآن پڑھا رہا ہے اور ہمیں دین کی باتیں سکھا رہا ہے، آپؐ نے فرمایا: جو کر رہے تھے وہی کرو''۔ ۲۵ زرعۃ بن عبد الرحمٰن نے اپنے والد (جن کا نام حافظ ابونعیم کے مطابق جرہد تھا اور جو اصحاب صفہ میں سے تھے) سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس بیٹھے، جب کہ میری ران کھلی ہوئی تھی، آپؐ نے فرمایا: اس کو ڈھانکو، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ران ستر ہے؟۔

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ کتاب وحکمت سے تعلیم و تربیت کے ذریعہ اصحابِ صفہ کو مطلوب درجہ تک پہنچا دیا، تا کہ وہ اسلام کی دعوت وتبلیغ اور اس کی تعلیمات کی نشر واشاعت کا فریضہ انجام دینے کے قابل ہو جائیں۔

(ب) تربیتی اور نفسیاتی سر پرستی

ایمانی طاقت اور اس کے لیے عظیم قربانیوں کے باوجود بحیثیت انسان بعض اہلِ صفہ فقر و فاقہ کی وجہ سے نفسیاتی طور پر پریشان ہوتے تھے، نبی ﷺ ان کی اس پریشانی کو خوب جانتے تھے، اور اسے حل کرنے یا کم از کم ہلکا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ آپ خود ہی پہل کر کے ان سے ان کے حالات وضروریات معلوم کرتے اور بتاتے کہ وہ جس حال میں ہیں وہ ان کے لیے بہتر ہے اور انجام کار ان کے مفاد

میں ہے۔اس سے ان کے دل خوش ہوتے ، پریشانی کم ہوتی اور ہمّت بڑھتی۔حضرت حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اصحابِ صفہ کے پاس آئے اور کہا: تم لوگ کیسے ہو؟ انھوں نے کہا: خیریت سے ہیں، آپؐ نے فرمایا: تم لوگ آج بہتر ہو، اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب تم میں سے کسی کو ایک طرف (کھانے کا) لگن ملے گا، اور دوسری طرف خوشبو، اور تم میں سے کوئی اپنے گھر پر کعبہ کی طرح پردے ڈالے گا؟ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول کیا ہم کو یہ سب ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! انھوں نے کہا: اس دن ہم بہتر ہوں گے، صدقہ وخیرات دیں گے اور غلام آزاد کریں گے! آپ نے فرمایا: نہیں! بلکہ تم لوگ آج بہتر ہو! اس لیے کہ جب تم کو وہ سب چیزیں ملیں گی تو آپس میں حسد، قطع رحمی اور بغض کرنے لگو گے''۔[۲۷] ثابت بنانی روایت کرتے ہیں کہ حضرت سلمانؓ ایک جماعت میں تھے جو اللہ کے ذکر میں مشغول تھی، نبی ﷺ کا اس جماعت کے پاس سے گذر ہوا تو وہ لوگ رک گئے۔آپؐ نے فرمایا: تم کیا کہہ رہے تھے؟ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول، ہم اللہ کا ذکر کرر ہے تھے، آپ نے فرمایا: ''ذکر کرتے رہو، اس لیے کہ میں نے تم لوگوں پر رحمت اترتے ہوئے دیکھا ہے، میں نے چاہا کہ میں بھی اس میں تمہارے ساتھ شامل ہو جاؤں''۔[۲۸]

اس پُر حکمت نفسیاتی وتربیتی اسلوب کے ذریعہ نبی ﷺ نے اس سچی مومن جماعت کو دنیوی فکر سے اوپر اٹھنے، پریشانی پر صبر کرنے اور اللہ کے ثواب اور دائمی نعمتوں کی لو لگانے پر آمادہ کیا۔

(ج) مادّی سرپرستی

اصحابِ صفہ اور دیگر غریب صحابہ کی علمی، تربیتی اور نفسیاتی سرپرستی کے علاوہ نبی ﷺ نمایاں طور پر ان کی مادّی خبر گیری بھی کرتے تھے۔آپ کے پاس جو چیز بھی کم یا زیادہ ہوتی یا بطورِ ہدیہ آتی، خود کو اس کی سخت ضرورت ہونے کے باوجود ان کو عطا فرماتے، اور ان کے کھانے پینے کی نگرانی اور خبر گیری کرتے، چنانچہ مجاہد بن جبرؒ نے

حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں: ''اللہ کی قسم، بھوک کی وجہ سے میں کبھی زمین پر بیٹھ جاتا تھا اور کبھی پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا...... یہاں تک کہ (ایک مرتبہ) میرے پاس سے رسول اللہ ﷺ گذرے اور میرے چہرے پر بھوک کے اثر کو پہچان لیا، آپؐ نے مجھے پکارا: ابو ہریرۃ! میں نے کہا: اے اللہ کے رسول، حاضر ہوں، آپؐ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے، وہاں آپ نے ایک پیالہ میں دودھ رکھا پایا، آپ نے (گھر والوں سے) پوچھا: یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ جواب دیا گیا: فلاں نے بھیجا ہے، آپ نے فرمایا: اے ابو ہریرۃ، جاکر اصحابِ صفہ کو بلالاؤ، حضرت ابو ہریرۃؓ کہتے ہیں: اس وقت آپ کا مجھ کو اہل صفہ کے پاس بھیجنا برا لگا، اور میں نے (دل میں) کہا: مجھے تو امید ہو رہی تھی کہ یہ دودھ مجھے پینے کو مل جائے گا، تمام اصحاب کا اتنے سے دودھ میں کیا بھلا ہوگا، مگر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے چارہ نہ تھا، اس لیے میں انھیں بلانے آیا، سب فوراً چل دیے، جب سب پہنچ گئے تو آپؐ نے فرمایا: ''اے ابو ہریرۃ، یہ لے کر ان کو دو''، میں ایک ایک آدمی کو دیتا جاتا، اور وہ پی کر سیراب ہوتا، یہاں تک کہ میں نے سب کو پلا کر اس کو رسول اللہ ﷺ کو واپس کیا''۔ آپؐ نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا، اور فرمایا: ''اب میں اور تم بچے'' میں نے کہا: آپ نے سچ فرمایا اے اللہ کے رسول! آپؐ نے فرمایا: پیو، میں نے پیا، پھر فرمایا، اور پیو، میں نے پھر پیا، آپؐ یہی فرماتے رہے، اور میں پیتا رہا، یہاں تک کہ میں نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دین حق کے ساتھ بھیجا ہے! اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔ تب آپؐ نے پیالہ لے کر باقی بچا ہوا دودھ نوش فرمایا۔ [29] یہی ایک روایت رسول اللہ ﷺ کی اہلِ صفہ کی خبر گیری، ان کی تنگی ترشی میں شرکت اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دینے پر دلالت کے لیے کافی ہے، نیز اس واقعہ میں جو طاقت ور ایمانی عناصر ہیں وہی اصحابِ صفہ کو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے لیے بڑی سے بڑی مشکلات کو خاطر میں نہ لانے پر آمادہ کرتے تھے۔

اصحابِ صفہ کی خبر گیری کے ذیل میں یہ بھی آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے

دولت مند صحابہ کے صدقات اصحابِ صفّہ نیز دیگر غریب مسلمانوں کو عطا فرماتے ،جنگوں کے ذریعہ حاصل ہونے والے اموال غنیمت ان میں تقسیم کرتے ،کبھی ان کو کھانا کھلانے کے لیے اپنے صحابہ کے سپرد کرتے تو حسبِ استطاعت کوئی دو ،کوئی تین ،کوئی چار یا اس سے زیادہ افراد کو اپنے گھر لے جاتا ، ابوعثمان نہدیؒ سے روایت ہے کہ ان سے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے بیان کیا: ''اہلِ صفہ غریب لوگ تھے ، رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ اپنے ساتھ تیسرے آدمی کو لے جائے ، اور جس کے پاس چار افراد کا کھانا ہو وہ اپنے ساتھ پانچویں اور چھٹے شخص کو لے جائے ، یہ سن کر ابوبکرؓ تین اشخاص کو اپنے ساتھ لے گئے اور خود اللہ کے نبی ﷺ دس کو۔[۳۰] محمد بن سیرینؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شام کے وقت اصحابِ صفّہ میں سے بعض افراد کو اپنے بعض صحابہ میں تقسیم فرمادیتے ،کوئی ایک ،کوئی دو ،کوئی تین (یہاں تک کہ انھوں نے دس تک بیان کیا) کو لے جاتا ۔حضرت سعد بن عبادہؓ ہر رات ان میں سے اسّی آدمیوں کو کھانا کھلانے اپنے گھر لے جاتے ۔[۳۱] ابن سعد نے یزید بن عبداللہ بن قسیط سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اصحابِ صفّہ کو رات کے کھانے کے وقت بلاتے ، اور ان کو اپنے صحابہ میں بانٹ دیتے ، اور ان میں ایک گروہ رسول اللہ کے ساتھ رات کا کھانا کھاتا ، یہاں تک کہ اللہ نے دولت عطا فرمائی ۔[۳۲]

نبی ﷺ کے علاوہ مال دار صحابہ اپنی استطاعت کے بقدر براہ راست بھی نیکی اور مدد کے کام انجام دیتے تھے ، چناں چہ حسن بصریؒ کی روایت ہے کہ '' صفّہ کم زور مسلمانوں کے لیے تعمیر ہوا تھا ، عام مسلمان ان کے ساتھ جو کچھ بھلائی کر سکتے تھے ، کرتے تھے۔[۳۳] اللہ کی راہ پر چلنے اور اس کے دین کی سر بلندی کے لیے صحابہ میں انفاق اور مسابقت کا جو جذبہ تھا اس سے ہر ایک واقف ہے ۔

اشاعتِ اسلام میں اصحابِ صفّہ کا حصہ

اسلام کی مدد اور اس کے اصولوں کی نشر و اشاعت میں اصحابِ صفّہ کا نمایاں

حصہ ہے۔انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اور اس کے بعد دیگر صحابہ کے ساتھ ہر میدانِ عمل میں شرکت کی۔ان میں مجاہدین وشہداء تھے جنھوں نے بہادری، ثابت قدمی اور بے خوفی کی شان دار مثالیں قائم کیں، ان میں علماء، مفتی، راوی اور حکام تھے جنھوں نے نبی ﷺ سے علم حاصل کیا اور دوسروں میں اس کو پھیلا دیا، اصحابِ صفہ نے دعوت وتبلیغ کے تقاضوں اور اس کی حفاظت کے لیے دیگر کام بھی انجام دیے، جیسے نبی ﷺ کی حفاظت و حراست اور حسبِ ہدایت خطوط و مراسلات کا پہنچانا وغیرہ۔ان میں بعض ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے ایک سے زیادہ قسم کے جلیل ترین کام اور مہمیں سر کیں۔

اسلام کے لیے تکلیفیں برداشت کرنا اور ثابت قدمی

یہ معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بہت سے صحابہ نے تکلیفیں اٹھا کر اسلام پر ثابت قدمی کے جوہر دکھائے۔ان میں سے جو لوگ ہجرت کے بعد مسجد نبوی میں رہتے تھے وہ اصحابِ صفہ کہلائے، ان میں مشرکین مکہ کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھانے والے جلیل القدر صحابہ بھی تھے، جیسے:

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ[۳۴] جنھوں نے نبی ﷺ کے بعد مکہ میں سب سے پہلے قرآن بآواز بلند پڑھا۔قریش اپنی انجمنوں میں بیٹھے تھے کہ آپ نے سورۃ الرحمٰن زور سے پڑھنی شروع کی، انھوں نے اٹھ کر آپ کو مارنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ لہولہان کر دیا،[۳۵] پھر یہ واقعہ کئی بار ہوا تو آپ حبشہ پھر مدینہ ہجرت کے لیے مجبور ہوئے۔[۳۶]

(۲) حضرت ابوذر غفاریؓ: نبی ﷺ کی بعثت کے حالات معلوم کر کے آپ سے ملاقات کے لیے مکہ آئے، مشکل سے ملاقات ہوئی، جب آپ کی باتیں سنیں تو اسلام کی ہدایت سے سرفراز ہوئے۔ان سے نبی ﷺ نے کہا: اپنی قوم کے پاس واپس جاؤ، یہاں تک کہ تمھارے پاس میرا حکم پہنچے، انھوں نے کہا: اس ذات کی قسم جس کے

ہاتھ میں میری جان ہے ان کے درمیان چیخ چیخ کر یہ دعوت پہنچاؤں گا، پھر وہاں سے نکل کر مسجد آئے اور بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھا، یہ سن کر لوگ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور انھیں مارتے مارتے زمین پر گرادیا، حضرت عباس بن عبدالمطلب نے ان پر اوندھے لیٹ کر ان کو بچایا اور قریش سے کہا: تمہارا برا ہو! کیا تم کونہیں معلوم کہ یہ قبیلۂ غفار کے ہیں جو تمہاری شام کی تجارت کے راستہ میں پڑتا ہے، حضرت ابوذرؓ نے پھر دوسرے دن وہی کیا اور لوگوں نے ان پٹائی کی اور حضرت عباس نے انھیں بچایا، اس کے بعد وہ اپنے وطن چلے گئے۔ جب نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اس کے بعد انھوں نے ہجرت کی ۳۷ اور مسجد نبوی اور صفہ کے ہو رہے، اس لیے ان کا شمار اصحابِ صفہ میں ہوا، ان سے مروی ہے: ''میں اصحابِ صفہ میں سے تھا، ہم شام کے وقت رسول اللہ ﷺ کے دروازہ پر حاضر ہوتے، تو آپؐ دیگر اصحاب کو حکم دیتے تھے کہ ہم میں سے ایک ایک آدمی کو (کھانے کے لیے) اپنے ساتھ لیتا جائے''۔ ۳۸

(۳) حضرت بلال بن رباحؓ: اسلام کے لیے آزمائش کے دوران انھوں نے سب سے زیادہ ثابت قدمی دکھائی، ان کا آقا امیہ بن خلف ان کو چلچلاتی دھوپ میں پیٹھ کے بل بطحائے مکہ میں ڈال دیتا تھا، پھر بڑا سا پتھر ان کے سینہ پر رکھنے کا حکم دیتا اور ان سے کہتا: ایسے ہی پڑے رہو گے، یہاں تک کہ مر جاؤ گے یا محمد کا انکار کرو اور لات وعزیٰ کی پوجا کرو۔ اسی حالت میں بلالؓ أَحَدُ أَحَدُ کہتے رہتے۔ ایک دن اسی حالت میں ابوبکر صدیقؓ وہاں سے گذرے، تو امیہ سے کہا: اس مسکین کے بارے میں کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟ امیہ نے کہا: تم نے اس کو بگاڑا ہے، اب جیسے چاہو اس کو خلاصی دلاؤ، ابوبکر نے کہا: میرے پاس اس سے زیادہ مضبوط ایک سیاہ فام غلام ہے، وہ تمہارے دین کا سختی سے پیروکار ہے، اس کے بدلے میں وہ تم کو دیتا ہوں، امیہ نے اسے منظور کرلیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس سے حضرت بلالؓ کو لے کر آزاد کردیا۔ بلالؓ کو سزا دینے کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ مشرکین ان کو بچوں کے سپرد کرتے تھے، جو ان کو مکہ کی وادیوں میں گھماتے پھرتے تھے، اور وہ أَحَدُ أَحَدُ کا ورد کرتے رہتے۔ ۳۹

(۴) حضرت عمار بن یاسرؓ: اپنے برادران، افرادِ خاندان اور والدین کی طرح بہت زیادہ ایذاؤں، تکالیف اور ظلموں سے دو چار ہوئے، ابن اسحٰق نے لکھا ہے: ''بنو مخزوم عمارؓ، ان کے والد یاسرؓ اور ماں سمیہؓ کو چلچلاتی دھوپ میں مکہ کی گرم ریت سے سزا دینے کے لیے نکلتے تھے، رسول اللہ ﷺ ان کے پاس سے گذرتے تو فرماتے: ''آل یاسر! صبر کا دامن تھامے رکھو، تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے''۔ مشرکین ان کو مارتے، گرمی کے موسم میں سخت گرم زمین پر ان کو گھسیٹتے پھرتے، اور بھوکا پیاسا رکھتے، دیگر قریشی سرکشوں کے ساتھ فاسق ابو جہل لوگوں کو ان کے خلاف اکساتا تھا، عمار کی ماں سمیہ اسلام پر ثابت قدم رہیں تو ابو جہل نے ان کو نیزہ سے مار ڈالا، وہ اسلام میں سب سے پہلے شہادت کا شرف پانے والی تھیں، عمار کو مشرکین برابر ناقابلِ برداشت تکلیفیں پہنچاتے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے زبانی طور پر ان کی بات مان لی، چناں چہ عبید بن محمد بن عمار کی روایت ہے: ''مشرکین برابر عمار کو تکلیفیں دیتے رہے، مجبوراً انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو برا بھلا کہا اور مشرکین کے معبودوں کا ذکرِ خیر کیا، اس کے بعد جب آپؐ کی خدمت میں آئے تو آپ نے پوچھا: کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا: اے رسول اللہ! بری خبر ہے، ان لوگوں نے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ میں نے آپ کی برائی اور ان کے معبودوں کا ذکر خیر نہ کیا، رسول اللہ ﷺ نے کہا: تمہارے دل کا کیا حال ہے؟ انھوں نے کہا: میں اپنے دل کو ایمان پر مطمئن پاتا ہوں، آپ نے فرمایا: اگر وہ پھر تنگ کریں تو تم بھی (جان بچانے کے لیے) وہی کرنا۔[۴۰] اسی سیاق میں یہ آیت اتری:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ، وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (النحل ۱۰۶)

مرتد وہ ہے جس نے ایمان کے بعد اللہ کا انکار کیا، سوائے اس شخص کے جس کو مجبور کیا گیا، مگر اس کا دل ایمان پر مطمئن رہا، لیکن جس شخص کو کفر پر شرحِ صدر ہو گیا، ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان پر بڑا عذاب ہے۔

(۵) خبّاب بن الأرت کو مشرکین کے بے رحمانہ ظلم اور مختلف قسم کی تکلیفوں سے سابقہ پڑا، انھوں نے انھیں زدو کوب کیا، زمین پر منھ کے بل گھسیٹا، ان کے اعضائے جسم کو داغا، اور طرح طرح سے تنگ کیا، مگر حضرت خبابؓ صابر اور ثابت قدم رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اور دوسرے کم زور مسلمانوں کی پریشانی دور کی، شعبیؒ سے روایت ہے کہ: ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت خبابؓ سے مشرکین کے مظالم کے بارے میں دریافت کیا تو خبّاب نے کہا: اے امیر المؤمنین میری پیٹھ ملاحظہ کریں، حضرت عمرؓ نے پیٹھ دیکھی تو کہا: ایسی پیٹھ میں نے کسی کی نہیں دیکھی، خبابؓ نے کہا: بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے مجھے سزا دینے کے لیے آگ جلائی تو اس کو میرے جسم کی چربی نے بجھایا'' حضرت قیسؒ حضرت خبابؓ سے روایت کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ ایک موقع پر کعبہ کے سایہ میں ایک چادر اوڑھے ہوئے لیٹے تھے، ہم نے عرض کیا: اللہ سے ہمارے لیے دعا فرمایئے؟ اللہ سے ہمارے لیے مدد مانگیے؟ یہ سن کر آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ آپ اٹھ بیٹھے اور فرمایا: اللہ کی قسم! بے شک تم سے پہلے ایک آدمی کو پکڑ کر دو ٹکڑے کر دیے جاتے تھے، مگر یہ وحشی سلوک بھی اس کو اس کے دین سے نہیں ہٹاتا تھا، یا اس کے گوشت اور پٹھوں میں لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں، مگر یہ غیر انسانی عمل بھی اس کو اس کے دین سے نہیں دوٗر کرتا تھا، اللہ یقیناً اس دین کو پورا کرے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرت موت تک جائے گا، مگر اسے راستے میں اپنی بکریوں کے لیے بھیڑیے کے علاوہ کسی کا خوف نہ ہوگا، لیکن تم ہو کہ جلد بازی کرتے ہو''۔ شعبی ہی سے ایک دوسری روایت ہے کہ: ''جب مشرکین تکلیفیں دیتے تھے تو اس زمانہ میں کوئی نہ تھا جس نے ان کے مطالبات نہ مانے ہوں، سوائے حضرت خبّابؓ کے۔ مشرکین ان کو گرم زمین پر لٹاتے، مگر ان کے منہ سے تکلیف کی کوئی آواز نہ نکلتی، حضرت خبابؓ نے خود بھی کہا ہے کہ: ''مجھے نہیں معلوم کہ کوئی شخص ایسی آزمائش سے گذرا ہو جیسی آزمائش سے میں دو چار ہوا۔[۴۹]

جہاد اور شہادت

مشرکین سے ہونے والے معرکوں میں دیگر صحابہ کی طرح اصحابِ صفہ کا حصہ بھی نمایاں تھا۔ان میں سرِ فہرست جنگ بدر تھی جس میں سرکردہ اصحابِ صفہ مہاجرین نے شرکت کی، ان میں سے بیش تر اس جنگ اور بعد کے دیگر اسلامی معرکوں میں شہید ہوئے۔مثال کے طور پر چند شرکاء کے نام یہ ہیں: حضرت بلال بن رباحؓ جنھوں نے معرکۂ بدر میں اللہ کے دشمن امیہ بن خلف کو قتل کیا۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جنھوں نے عفراء کے دونوں بیٹوں کے ابوجہل پر حملہ کے بعد اس کا کام تمام کیا، اور اس کے بعد کی تمام جنگوں میں بھی شریک رہے، ۴۲ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اسلام میں پہلا تیر پھینکنے والے، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت زید بن خطابؓ، حضرت سالم بن عمیرؓ، حضرت خریم بن فاتک بن اُثوس طائیؓ، حضرت حارثہ بن نعمانؓ، حضرت خنیس بن حذافہؓ، حضرت خبیب بن یسافؓ، حضرت خباب بن اُرتؓ، حضرت صفوان بن بیضاءؓ، حضرت سالم مولی ابی حذیفہؓ وغیرہ جنھوں نے غزوۂ بدر اور بعد کے معرکوں میں شرکت کی۔

شہادت اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے تمام لوگوں کی اعلیٰ ترین آرزو ہوتی تھی۔اصحابِ صفہ میں بھی چند ایسے خوش نصیب تھے جن کو جہاد کے ساتھ شہادت کی نعمت بھی حاصل ہوئی، مثال کے طور پر حضرت زید بن خطابؓ معرکۂ احد میں اور حضرت سالم مولی ابو حذیفہؓ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔حضرت سالمؓ اپنے سیدھے ہاتھ میں مہاجرین کا جھنڈا لیے ہوئے تھے، یہ کٹا تو اسے بائیں ہاتھ میں سنبھال لیا، وہ کٹا تو جھنڈے کو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور یہ آیت پڑھتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کردی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران۱۴۴)	محمد تو ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے، کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل ہوگئے تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔

روایت اور تعلیم

اصحابِ صفہ کو رسول اللہ ﷺ سے علم حاصل کرنے کی بڑی فکر تھی۔ یہی فکر اور تمنا ان کی مدینہ ہجرت اور صفہ میں قیام کا اہم ترین سبب تھی۔ وہاں ایمان کا چشمہ ابلتا تھا۔اور وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ لگے رہتے تھے، اس لیے ان کو حفظ و روایت کی وسیع دولت حاصل ہوئی، جس سے سنت کی حفاظت و اشاعت اور تعلیم کا بڑا کام انجام پایا۔ چند نمایاں ترین اصحابِ صفہ راویوں کے نام یہ ہیں:

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ جو علم و روایت کی تحقیق و تلاش کے بڑے ماہر تھے۔ ذہبیؒ نے کہا ہے: وہ پی تلی بات کہنے والوں اور روایت میں سختی کرنے والوں میں سے تھے، حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک بار ان کو کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا تو کہا: وہ علم سے بھرے ہوئے ہیں، ۴۳ ان کی تلاش و تحقیق اور سختی کے باوجود ان سے بہت سی روایات مروی ہیں، جو بہت سے احکام اور اسلام کے اعلیٰ اصولوں پر مشتمل ہیں۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ نے نبی ﷺ سے بہت سی روایتیں بیان کیں، پھر ان سے بہت سے صحابہ و تابعین نے یہ روایتیں نقل کیں، وہ علم کے سردار اور حضرت ابن مسعودؓ کے ہم پلہ عالم تھے۔ ۴۴

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے بھی رسول اللہ ﷺ سے بہت سی روایتیں بیان کی ہیں اور ان سے دیگر صحابہ و تابعین نے روایتیں لی ہیں، جیسے حضرت عائشہؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، جابر بن سمرۃؓ، سعید بن مسیبؒ، ابوعثمان نہدی، قیس بن ابی حازم وغیرہ۔ ۴۵

حضرت ابو سعید خدریؓ نے نبی ﷺ، حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، زید بن ثابتؓ سے روایتِ حدیث کی اور خود ان سے صحابہ میں ابن عباس، ابن عمر، جابر بن عبد اللہ، محمود بن لبید، ابو امامہ، ابو الطفیل رضی اللہ عنہم، اور تابعین میں ابن مسیّب، ابوعثمان نہدی، طارق بن شہاب رحمہم اللہ نے روایات لیں۔ وہ کثیر الروایۃ تھے، ان کی مرویاتِ

حدیث کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے، چناں چہ خطیبؒ نے کہا ہے: وہ فاضل ترین صحابہ میں سے تھے اور بہت سی حدیثیں انھوں نے حفظ کی تھیں۔ ۴۶؎

حضرت سلمان فارسیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی اور ان سے صحابہ کرام میں حضرت انس بن مالک، کعب بن عجرۃ، ابن عباس، ابو سعید وغیرہ نے اور تابعین میں ابو عثمان نہدی، طارق بن شہاب، سعید مسیّب نے روایت کی۔ وہ علمائے صحابہ میں سے تھے۔ ان کے بارے میں حضرت علی بن طالبؓ سے سوال ہوا تو کہا: ''وہ ہم اہل بیت میں سے نہ ختم ہونے والا سمندر ہیں''۔ ۴۷؎

حضرت ابو ہریرۃ عبدالرحمٰن بن صخر دوسیؓ نے رسول اللہ ﷺ اور بیش تر صحابہ سے روایت کی اور منقول ہے کہ ان سے تقریباً آٹھ سو صحابہ و تابعین نے روایت کی ہے، صحابہ میں وہ سب سے زیادہ حدیث کے حافظ اور اس کی روایت کرنے والے ہیں۔ ربیع نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے: ''حضرت ابو ہریرۃؓ سب سے زیادہ حافظ ہیں اور ان کی روایات کی تعداد تقریباً پانچ ہزار ہے''۔ ۴۸؎

اصحابِ صفہ نے حضور ﷺ سے روایت کرنے اور احادیث حفظ کرنے کے علاوہ دوسرے لوگوں تک اس علم کو پہنچانے کی بھی کوشش کی۔ دیگر صحابہ کی طرح اصحابِ صفہ میں سے ہر ایک نے، اس جگہ جہاں اس نے سکونت اختیار کی یا اس کو بھیجا گیا، ایک مدرسہ یا مکتب فکر کی حیثیت اختیار کر لی، بعض لوگ علم و فضل کے لحاظ سے اس لائق تھے کہ تعلیم کی خدمت ہی ان کے سپرد ہوئی، جیسے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، جن کو حضرت عمر ابن خطابؓ نے اہلِ کوفہ کا معلّم اور اس کے امیر کا وزیر بنا کر بھیجا، چناں چہ سفیان ثوریؒ نے ابو اسحٰقؒ سے، اور انھوں نے حارثہ بن مضربؒ سے روایت کی ہے کہ: ہمارے سامنے حضرت عمرؓ کا خط پڑھا گیا، اس میں لکھا تھا کہ: ''میں نے تمہارے پاس عمار بن یاسرؓ کو امیر اور عبد اللہ بن مسعودؓ کو معلّم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے، وہ دونوں اہلِ بدر صحابہ میں شریف ترین ہیں، تم ان کی بات سنو اور ان کی اطاعت کرو''، انھوں نے مزید لکھا تھا کہ ''میں نے عبد اللہ بن مسعودؓ کو بھیج کر تم کو اپنے اوپر ترجیح دی ہے''۔ ۴۹؎

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو ہریرۃؓ کو بحرین کا والی اور وہاں کے باشندوں کی دینی ضروریات کا معلّم بنا کر بھیجا تھا۔

حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں حضرت علی بن ابی طالبؓ نے فرمایا: ''علم میں ان کی گہرائی معلوم نہیں کی جاسکتی'' دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''وہ نہ ختم ہونے والا سمندر ہیں'' وہ علم و تعلیم کی طرف توجہ کے لیے معروف تھے، ایک مرتبہ ان کے پاس سے بنو عبس کا ایک آدمی گذرا جس نے دجلہ سے ایک گھونٹ پانی پیا تھا، سلمانؓ نے اس سے کہا: واپس جا کر اور پانی پیو، اس نے کہا: میں تو سیراب ہو گیا، سلمان نے کہا: کیا تمہارے اس گھونٹ نے سمندر میں کچھ کمی کی؟ اس نے کہا: میرے پینے سے اس میں کچھ کمی ہونے والی نہیں، سلمانؓ نے فرمایا: علم کی یہی حالت ہے کہ وہ کم نہیں ہوتا، اس لیے جو علم تم کو فائدہ پہنچائے اس کو حاصل کرو''۔ ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے کہا: ''اے بنو عبس کے بھائی! علم بہت ہے، عمر کم ہے، اس لیے علم میں سے دینی امور کی ضرورت کی چیزیں حاصل کرو''۔[50]

ان کے علاوہ دیگر اصحابِ صفّہ نے بھی اور صحابہ کے ساتھ اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے ترویج علم اور تعلیم کی خدمات انجام دی ہیں۔

قیادت

کئی اصحابِ صفّہ نے فتح یاب اسلامی لشکروں اور فوجی مہموں کی قیادت کی ہے جس کی وجہ سے دشمنوں پر مسلمانوں کی قوت ظاہر ہوئی اور رعب قائم ہوا۔ ان کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

حضرت سعد بن وقاصؓ: جنگ قادسیہ میں مسلمانوں کے لشکر کے قائد تھے جس میں کسریٰ اور اس کے لشکر کو شکست فاش ہوئی اور عراق کا بڑا علاقہ فتح ہوا۔[51]

حضرت سلمان فارسیؓ نے بھی ایک مسلم لشکر کی قیادت کرتے ہوئے ایک ایرانی قلعہ کا گھیراؤ کیا اور اسے فتح کرلیا۔[52]

حضرت عکاشہ بن محصن اسدیؓ نے غمر کی طرف بھیجی گئی جنگی مہم کی قیادت کی

جو بنو اسد کے پانی کی جگہ ہے، اس حملہ میں وہ دشمنوں کے دوسو اونٹ ہانک کر مدینہ لے گئے اور انھیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ۵۳

ان کے علاوہ بھی اصحابِ صفہ نے اللہ کے دین کی مدد اور اس کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے اسلامی لشکر کی قیادت یا ان میں سرگرم شرکت کی ہے۔

ولایت اور حکم رانی

فوجی قائدین کے علاوہ اصحابِ صفہ میں بعض اسلامی شہروں کے والی و حکام بھی ہوئے ہیں۔ ان میں ممتاز ترین یہ ہیں:

حضرت سعد بن وقاصؓ کو حضرت عمر بن خطابؓ نے کوفہ کا والی مقرر کیا تھا، انھوں نے ہی یہ شہر آباد کیا۔ ان کے بعد اس کے والی حضرت عثمان بن عفانؓ ہوئے۔ ۵۴ حضرت سعدؓ نے اپنے اور دیگر غریب مسلمانوں پر اللہ کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے کہا: مجھے وہ دن یاد ہے جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہم سات افراد تھے جن کے پاس کھانے کے لیے صرف درخت کے پتے تھے، جن سے ہمارے جبڑے چھل گئے تھے، ہاں! میں نے ایک چادر لقطہ کے طور پر اٹھا کر اس کو اپنے اور سعد بن مالکؓ کے درمیان پھاڑ کر بانٹ لیا تھا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان ساتوں آدمیوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی شہر کا والی نہ ہوا ہو۔ ۵۵

حضرت عمار بن یاسرؓ کو بھی حضرت عمر بن خطابؓ نے کوفہ کا امیر بنایا تھا اور ان کے ساتھ اہلِ کوفہ کی تعلیم کے لیے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو بھیجا تھا۔ دونوں کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: ''یہ دونوں حضرت محمد ﷺ کے معزز صحابہ میں سے ہیں''۔ ۵۶

حضرت عقبہ بن عامرؓ والی مصر اور اس کی فتح میں بھی شریک تھے۔ بڑے عالم، شاعر اور ماہر تیراندازوں میں تھے۔ ۵۷

حضرت سلمان فارسیؓ مدائن کے امیر تھے۔

حضرت ابو ہریرۃؓ حضرت عمر بن خطابؓ کے عہد میں بحرین کے امیر بنے۔
ان کے علاوہ بھی اصحابِ صفہ میں والی اور امیر ہوئے جنھوں نے اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو بہترین انداز میں انجام دیا۔

افتاء

قیادت و حکم رانی کے علاوہ بعض اصحابِ صفہ کو افتاء میں بڑا مقام حاصل ہوا اور ان کی طرف لوگوں کا رجوع عام ہوا جیسے:

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ: خلفاء راشدین کے زمانہ میں لوگ ان سے مسائل پوچھتے اور وہ فتوی دیتے تھے، اس لیے ان کو مفتی صحابہ کے طبقۂ اوّل میں کثرت سے فتوی دینے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ۵۸ ذہبیؒ نے لکھا ہے: اکابر صحابہ میں وہ علم کا خزانہ اور ہدایت کے امام تھے، ان کے بعد حضرت ابو ذر غفاریؓ کا مرتبہ ہے جو خود علم کے سردار تھے اور علم میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے ہم پلّہ تھے، لیکن کہا گیا ہے کہ وہ فتوی دینے میں سخت محتاط تھے۔ ۵۹

حضرت ابو ہریرۃؓ: علم و فضل اور فقہ میں مہارت کی وجہ سے وہ بھی ان لوگوں میں ہیں جن کو افتاء کا مقام حاصل ہوا۔ ابن سعد زیاد بن مینا کی روایت میں ہے کہ: حضرت عثمانؓ کی وفات کے بعد سے اپنی اپنی وفات تک مدینہ میں ابن عباس، ابن عمر، ابوسعید، ابو ہریرۃ اور جابر اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ فتوی دیتے تھے، اور انہی پانچوں کو یہ خدمت تفویض ہوئی تھی۔ ۶۰

حضرت ابو سعید خدریؓ: مذکورہ بالا پانچ مفتی صحابہ میں ان کا بھی شمار ہے، ذہبی نے کہا ہے: علمائے صحابہ میں سے تھے، بیعت رضوان میں شریک تھے، حدیث کی بہ کثرت روایت کی اور ایک مدت تک فتوی دیا۔ ۶۱

حضرت سلمان فارسیؓ بھی علم و فضل اور فتوی کے لیے مشہور تھے۔

ان کے علاوہ بھی اصحابِ صفہ میں مزید اشخاص ہیں جن سے فتوے مروی ہیں۔

نبی ﷺ کی خدمت

نبی ﷺ کی بہت سے صحابہ نے خدمت کی ہے، جن میں خاصی تعداد اصحابِ صفہ کی ہے۔یہ حضرات آپؐ کی خدمت و اطاعت محض اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کرتے تھے، اسی وجہ سے وہ آپ کی خدمت اور آپ کے احکام کی تعمیل میں مسابقت اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش میں رہتے۔ان میں بعض خدمت گاروں کے نام یہ ہیں:

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے رسول اللہ ﷺ کے تکیہ، لباس، مسواک اور نعلین کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔وہ ان کو بوقت ضرورت حاضر کرتے تھے،۶۲

حضرت سلمان فارسیؓ نے آپ کی مصاحبت اور خدمت اختیار کر رکھی تھی۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ بھی آپ کے ہم نشین و مصاحب رہے اور خدمت کی عزت حاصل کی۔۶۳

حضرت ابو ہریرہؓ کو طویل صحبت و خدمت کا موقع ملا۔وہ آپؐ کے وضو کے لیے پانی لاتے، آپؐ کسی سے ملنا چاہتے تو اس کو بلالاتے، پیغام دینا چاہتے تو اس کو پیغام پہنچا دیتے، یا اصحابِ صفہ وغیرہ میں سے کوئی آپ تک کوئی چیز بھیجتا تو لے جاتے، چناں چہ صحیح بخاری میں ہے: حضرت ابو ہریرہؓ آپ کے وضو کے برتن اور دیگر ضرورت کی چیزیں اٹھاتے ...۶۴ رسول اللہ ﷺ آپ ہی کے ذریعہ اصحابِ صفہ کو کھانے پینے وغیرہ کے لیے بلاتے تھے، کبھی آپؐ ان کے ساتھ بازار جاتے، حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں: ”ایک دن رسول اللہ ﷺ گھر سے نکلے تو مجھے مسجد میں پایا، آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑا، میرا سہارا لیا، اور مجھے لے کر بنی قینقاع کے بازار پہنچے، راستے میں مجھ سے کوئی بات نہ کی، بازار میں گھومے، دیکھا بھالا، پھر واپس ہوئے تو میں بھی آپ کے ساتھ لوٹا...۔۶۵

نبی ﷺ کی پہرہ داری

بوقت ضرورت اصحابِ صفہ نے رسول اللہ ﷺ کی پہرہ داری کی خدمت بھی

انجام دی ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بارے میں صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ: ایک رات رسول اللہ ﷺ کی نیند اچاٹ ہوگئی تو فرمایا: ''کاش میرے صحابہ میں سے کوئی نیک آدمی آج رات میری پہرہ داری کا کام کرتا''، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں: ہم نے ہتھیار کی آواز سنی تو آپؐ نے فرمایا: کون؟ آواز آئی: ''سعد بن ابی وقاص! آپ کی پہرہ داری کے لیے آیا ہوں''، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ سوگئے، یہاں تک کہ میں نے آپ کے خراٹے کی آواز سنی۔ ٦٦

حضرت بلال بن رباحؓ نے بھی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وغیرہ کے ساتھ وادی القری میں آپ کی پہرہ داری میں حصہ لیا ہے۔ ٦٧

دیگر کام

اسلامی دعوت کو ابتدا میں دشمنوں کے نرغے سے بچانا اوراس کی حفاظت کے لیے ایذا کے سر چشموں کو بند کرنا ضروری تھا۔ یہ کام بھی بعض اصحابِ صفہ نے اپنی جان پر کھیل کر انجام دیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری طرف سے خالد بن نبیح کے لیے کون کافی ہوگا جو بنو ہذیل سے ہے اور اس وقت عرفہ کی طرف روانہ ہوا ہے؟ حضرت عبد اللہ بن انیسؓ نے کہا: ''میں، اے اللہ کے رسول، مجھے اس کی شکل وصورت بتائیں''۔ حضور نے کہا: ''تم جب اس کو دیکھو گے تو ہیبت زدہ ہو جاؤ گے''۔ عبد اللہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں کبھی کسی چیز سے ہیبت زدہ نہیں ہوا''، پھر عبد اللہ نکلے، یہاں تک کہ غروبِ آفتاب سے قبل عرفہ کے پہاڑوں کے پاس پہنچے، عبد اللہ کہتے ہیں: میں ایک آدمی سے ملا، جس کو دیکھ کر مرعوب ہوا، جب میں اس کے قریب پہنچا تو میں نے پہچان لیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، اس آدمی نے مجھ سے پوچھا: کون ہو؟ میں نے کہا: ضرورت مند، کیا رات گذارنے کی

جگہ ہے؟ اس نے کہا: ہاں! آؤ، میں اس کے پیچھے چلا، عصر کی دو ہلکی رکعتیں پڑھیں اور میں ڈرا کہ کہیں وہ شخص دیکھ نہ لے، پھر میں اس کے پیچھے پہنچ گیا اور اس کو تلوار سے مارا، پھر نکلا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر اس کی اطلاع دی۔ ۶۸

ان متنوع قسم کے بڑے اعمال کی انجام دہی کے ذریعے اصحابِ صفہ نے باقی صحابہ کے ساتھ اسلام کے ستون مستحکم کرنے، اس کے اصول و تعلیمات کی اشاعت کرنے اور دشمنوں کے مکر و فریب کو شکست دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اصحابِ صفہ صرف عبادت کے لیے فارغ اور اورادو وظائف میں مشغول لوگ نہ تھے، جنھیں حق و باطل کے درمیان برپا کشمکش، خیر و شر کے معرکہ اور اسلام اور کفر کے مابین جنگ کی کوئی فکر نہ تھی، بلکہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے شرک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور اس کی جگہ اسلام کی دعوت برپا کرنے کے لیے تن من سے پورا پورا حصہ لیا، اور دیگر صحابہ کرام کی طرح اس میں شریک رہے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

حواشی و مراجع

۱ یاقوت حموی، معجم البلدان، داراحیاء التراث العربی، ۱۳/۱۱۴، ابن الأثیر، النہایۃ فی غریب الحدیث، تحقیق طاہر الزاوی، محمود طناحی، المکتبۃ العلمیہ، بیروت، ۳/۳۷

۲ معجم البلدان، ۱۳/۱۱۴

۳ ابن حجر، فتح الباری شرح صحیح البخاری، داراحیاء التراث العربی، ۱۱/۲۸۷

۴ ابونعیم اصفہانی، حلیۃ الأولیاء وطبقات الاصفیاء، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱/۳۳۶

۵ ابن سعد، الطبقات الکبری، دار بیروت للطباعۃ والنشر، بیروت، ۱/۲۵۵

۶ حلیۃ الأولیاء، ۱/۳۳۸ ۷ حلیۃ الأولیاء، ۱/۳۳۹

۸ حلیۃ الأولیاء، ۱/۳۴۰ ۹ فتح الباری، ۱۱/۲۸۷

۱۰ حلیۃ الأولیاء، ۱/۳۳۹ ۱۱ الطبقات الکبری، ۱/۲۵۵

۱۲۔ حلیة الأولیاء ،۱/ ۳۴۱، ذهبی ، سیر أعلام النبلاء ، تحقیق شعیب ارنؤوط ، مؤسسة الرسالة ، عمان ، ۳/ ۳۸۵

۱۳۔ ابن تیمیة ، مجموع الفتاوی ، الرئاسة العامة لشؤون الحرمین ، ۱/ ۴۱

۱۴۔ فتح الباری ، ۱/ ۲۸۷

۱۵۔ سخاوی ، أسماء أهل الصفة ، مخطوطہ نمبر ۶۶۶۵ ، مکتبة وطنیه ، تونس ، ص ۲۰۸

۱۶۔ قرطبی ، الجامع لأحکام القرآن ، دار الکتب العلمیة ، بیروت ، ۶/ ۴۳۱-۴۳۲

۱۷۔ مسلم ، الجامع الصحیح مع شرح النووی ، دار الفکر و مؤسسة مناهل العرفان ، بیروت ، ۱۵/ ۱۸۷-۱۸۸

۱۸۔ حلیة الأولیاء ، ۱/ ۳۴۵

۱۹۔ ابن ماجه ، السنن ، تحقیق محمد فؤاد عبد الباقی ، ۲/ ۱۳۸۲-۱۳۸۳ ، محقق کا کہنا ہے کہ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ حلیة الأولیاء ۱/ ۳۴۴ ، ابن کثیر ، تفسیر القرآن العظیم ، دار القلم ، بیروت ، ۱/ ۵۸۰-۵۸۱

۲۰۔ تفسیر ابن کثیر ۴/ ۴۶۱

۲۱۔ حلیة الأولیاء ، ۱/ ۳۴۳ ، تفسیر ابن کثیر ۲/ ۴۱۶ ، ہیثمیؒ نے اس کے راویوں کو صحیح کا راوی بتایا ہے۔ مجمع الزوائد ، دار الکتاب العربی ، بیروت ، ۷/ ۲۱

۲۲۔ حلیة الأولیاء ، ۱/ ۳۵۳ ، ابن منظور ، لسان العرب ، دار المعارف ، ۴/ ۲۶۹۰

۲۳،۲۴۔ حلیة الأولیاء ، ۱/ ۳۴۲ ۲۵۔ حلیة الأولیاء ، ۱/ ۳۴۱

۲۶۔ دارمی ، السنن ، دار الکتب العلمیة ، بیروت ، ۲/ ۲۸۱

۲۷۔ حلیة الأولیاء ، ۱/ ۳۴۰ ۲۸۔ حلیة الأولیاء ، ۱/ ۳۴۲-۳۴۳

۲۹۔ بخاری ، الجامع الصحیح ، دار الفکر ، ۱۱/ ۲۴۱ ، اور سنن الترمذی ، ابواب صفة القیامة ، باب ۳۶

۳۰۔ حلیة الأولیاء ، ۱/ ۳۳۸ ۳۱۔ حلیة الأولیاء ، ۱/ ۳۴۱

۳۲۔ الطبقات الکبری ، ۱/ ۲۵۵ ۳۳۔ حلیة الأولیاء ، ۱/ ۳۴۰

۳۴۔ حلیة الأولیاء ، ۱/ ۳۷۵

۳۵ ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۷/ ۱۶۹

۳۶ ابن حجر عسقلانی، الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ، دار العلوم الحدیثۃ، ۲/ ۳۶۹

۳۷ الاصابۃ، ۴/ ۶۲-۶۳

۳۸ حلیۃ الأولیاء ۱/ ۳۵۲، الطبقات الکبری ۱/ ۲۵۶

۳۹ حلیۃ الأولیاء، ۱/ ۱۴۷-۱۴۸، البدایۃ والنھایۃ، ۳/ ۵۵-۵۶

۴۰ حلیۃ الأولیاء، ۱/ ۱۳۹-۱۴۱، البدایۃ والنھایۃ، ۳/ ۵۶

۴۱ حلیۃ الأولیاء، ۱/ ۱۴۳-۱۴۴، البدایۃ والنھایۃ، ۳/ ۵۷-۵۸

۴۲ البدایۃ والنھایۃ، ۳/ ۱۶۹-۱۷۰

۴۳ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱/ ۱۳-۱۴، الإصابۃ ۲/ ۳۶۸-۳۷۰

۴۴ تذکرۃ الحفاظ، ۱/ ۱۷-۱۸، الإصابۃ، ۲/ ۶۲-۶۴

۴۵ الاصابۃ، ۲/ ۳۳، سیوطی، تحقیق عرفان عبدالقادر حسونہ، دار الفکر للطباعۃ والنشر، ص ۲

۴۶ الاصابۃ، ۲/ ۳۵-۳۶

۴۷ ابن عبد البر، الاستیعاب فی أسماء الأصحاب، بحاشیۃ الاصابۃ، دار العلوم الحدیثۃ، ۲/ ۵۶-۶۱ الاصابۃ ۲/ ۶۲

۴۸ سیر أعلام النبلاء، ۲/ ۶۳۲، الاصابۃ، ۴/ ۲۰۲-۲۰۵

۴۹ تذکرۃ الحفاظ، ۱/ ۱۳-۱۴

۵۰ حلیۃ الأولیاء، ۱/ ۱۸۵-۱۸۷

۵۱ الاصابۃ، ۲/ ۳۳

۵۲ حلیۃ الأولیاء، ۱/ ۱۸۹

۵۳ الطبقات الکبری، ۲/ ۸۴، ابن سید الناس، عیون الأثر فی فنون المغازی، ۲/ ۱۴۹

۵۴ الاصابۃ، ۲/ ۳۳-۳۴

۵۵ حلیۃ الأولیاء، ۱/ ۹۳

۵۶ البدایۃ والنھایۃ، ۷/ ۳۲۳، الاصابۃ، ۲/ ۵۱۲

۵۷ سیر أعلام النبلاء، ۲/ ۴۶۷

۵۸ تدریب الراوی، ص ۳۸۰

۵۹ تذکرۃ الحفاظ، ۱/ ۱۶-۱۹

۶۰ الطبقات الکبری، ۲/ ۳۷۲

۶۱ تذکرۃ الحفاظ، ۱/ ۴۴

۶۲ حلیۃ الأولیاء، ۱/ ۱۲۶، البدایۃ والنھایۃ، ۷/ ۱۶۹

۶۳ حلیة الأولیاء، ۱/ ۱۵۷-۱۶۴ ۶۴ صحیح البخاری ۲/۲۴۰، مسند احمد بن حنبل ۱/۷/۲۷

۶۵ الحاکم ابوعبداللہ نیسابوری، المستدرک، دارالکتاب العربی، بیروت، ۳/۱۶۶

۶۶ مسلم مع شرح النووی، ۱۵/۱۸۲-۱۸۳

۶۷ عیون الأثر ۲/۴۱۴ ۶۸ حلیة الأولیاء، ۲/۵

اعلانِ ملکیت سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، فارم: ۴، رول: ۹

۱۔ مقام اشاعت: پان والی کوٹھی دودھ پور، علی گڑھ

۲۔ نوعیت اشاعت: سہ ماہی

۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری

۴۔ قومیت: ہندوستانی

پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری،

پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

۶۔ ملکیت: ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی،

پان والی کوٹھی دودھ پور، علی گڑھ

<u>بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی</u>

۱۔ مولانا سید جلال الدین عمری (صدر)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

۲۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی (سکریٹری)

فریدی ہاؤس، سرسید نگر، علی گڑھ (یوپی)

۳۔ ڈاکٹر محمد رفعت (خازن)

شعبۂ فزکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۴۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری (رکن)

الریحان، مزمل منزل کمپلکس، علی گڑھ

۵۔ مولانا محمد فاروق خاں (رکن)

۱۳۵۳- بازار چتلی قبر، دہلی-۶

۶۔ مولانا مطیع اللہ کوثر یزدانی (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی، ۲۵

۷۔ جناب ٹی، کے، عبداللہ (رکن)

مالاتھن کنڈی ہاؤس، بیلیری، کالی کٹ

۸۔ ڈاکٹر احمد سجاد (رکن)

طارق منزل، بریاتو ہاؤسنگ کالونی، رانچی

۹۔ جناب محمد جعفر (رکن)

ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

۱۰۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (رکن)

مزمل منزل کمپلکس، علی گڑھ (یوپی)

۱۱۔ انجینیر سید سعادت اللہ حسینی (رکن)

نان دیڑ

مندرجہ بالا معلومات میرے علم و یقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر

سید جلال الدین عمری

تعارف وتبصرہ

قاموس الفاظ واصطلاحاتِ قرآن

(افادات مولانا امین احسن اصلاحیؒ) ترتیب وتحقیق: اورنگ زیب اعظمی

ناشر: اسلامک بک سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، صفحات ۵۰۰، قیمت: ۲۰۰ روپے

مولانا امین احسن اصلاحیؒ (م ۱۹۹۷ء) کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس میں قرآن کریم کے ادبی و بلاغی پہلو پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور اس کے اسالیب، الفاظ اور اصطلاحات کی بھرپور تشریح کی گئی ہے۔ اس طرح اردو قارئین پر بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن کے اختیار کردہ الفاظ اور اسالیب کتنے برمحل اور معنویت سے پُر ہیں۔ اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۹۳۰ء) کی گراں قدر تحقیقات سے استفادہ کرنے کے ساتھ مولانا اصلاحی نے خود بھی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ان تشریحات کو جمع کردیا گیا ہے۔ دورانِ تشریح لغت و تفسیر کی جن کتابوں کا تذکرہ ہے، جن اشعار سے استشہاد کیا گیا ہے اور جن ماہرینِ لغت اور مفسرین کے تائیدی اقوال پیش کیے گئے ہیں، فاضل محقق نے حواشی میں ان کے مکمل حوالے دیے ہیں، اور مولانا کی بعض تحقیقات کی تائید میں مزید اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ تدبر قرآن کی ورق گردانی، الفاظ و اصطلاحات کے انتخاب، ترتیب اور حوالوں کی فراہمی میں خاصی محنت کی گئی ہے۔

فاضل مرتب نے تدبر قرآن کے ہر اقتباس کے آخر میں تاج کمپنی ایڈیشن کی جلد اور صفحہ نمبر دینے کا اہتمام کیا ہے، لیکن بہت سی جگہوں پر حوالے چھوٹ گئے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہوں الفاظ **سفع، اعجال، میر، ضاحکة، اخذة، بخس، بلدطیب، ثمرات، مثانی، حقب** وغیرہ۔ انھوں نے بقول خود ''طلبہ کی سہولت کے لیے'' الفاظ کی ترتیب مادہ کے حساب سے کی ہے۔ اگر انھیں مادہ کے بجائے ابتدائی حروف کے اعتبار سے مرتب کیا جاتا تو عام قارئین کو بھی استفادہ میں سہولت ہوتی۔ ویسے مادہ کے اعتبار سے بہت سے الفاظ اپنے صحیح مقام پر نہیں آسکے ہیں جیسے **بیّنة، تبتّل، سفع،**

ضاحکة ، **ضیزی** ، **متطوع** ، **طول** ، **طائر**، **صواعق** ، **سید**، **اعتراء** ، **غلب**، **تفاوت**، **منسأة**، **نظر** ، **انفاض** ، **نقع** ، **ھاج**، **تسخیر** ۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لفظ 'مسد' کو ان الفاظ کے ساتھ رکھا گیا ہے جن کے مادہ کا پہلا حرف س ہے اور لفظ 'تمکین' کو ان الفاظ میں شامل کیا گیا ہے جن کے مادہ کا پہلا حرف ک ہے ۔ بعض الفاظ کی تشریحات دوسرے الفاظ کے ضمن میں ہیں۔ مثلاً **جوابی** ، **جفان** کے ساتھ، **لمزة** **ھمز** کے ساتھ، **سیئة** ، **حسنة** کے ساتھ **ھضم** **ظلم** کے ساتھ۔

قرآن کے بہت سے الفاظ ایک سے زائد معانی رکھتے ہیں۔ ان کی تشریحات کو یکجا کر دیا گیا ہے ۔ اگر ساتھ میں آیتیں بھی ذکر کر دی جاتیں تو واضح ہوتا کہ کن آیات میں وہ الفاظ کن معانی میں ہیں۔ زیادہ بہتر ہوتا کہ ہر لفظ کے ساتھ آیت کا متعلقہ حصہ دے دیا جاتا ہے جس میں وہ لفظ آیا ہے، اس سے قارئین کو سہولت ہوتی ۔

بعض دیگر چھوٹی موٹی غلطیاں بھی ہیں۔ مثلاً **تؤزھم ازاً** (مریم۔۸۳) کو ذ سے سمجھ لیا ہے اور ترتیب میں اسی کا لحاظ کیا ہے، ایک جگہ لفظ 'ربیّ' لکھا ہے، مگر اقتباس میں اس کے بجائے **وھن**، **ضعف** اور **استکانة** کی تشریح ہے (ص ۱۴۴۔۱۴۵) **مھیمن** (ص ۴۳۹، ۴۴۷) اور **سحت** (ص ۱۹۰،۱۹۴) کو دو جگہوں پر ذکر کیا گیا ہے اور الگ الگ اقتباسات دیے ہیں۔ **سوی** (ص ۲۱۵، ۲۱۶) اور **افاض** (ص ۳۴۰، ۳۴۱) مکرر ہیں ۔ کتاب میں حواشی کے نمبر ۳۷۵ تک پڑے ہوئے ہیں، مگر ۳۲۲ کے بعد کے حواشی غائب ہیں۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ مرتب نے الفاظ و اصطلاحات جمع کرنے میں دقّت نگاہی سے کام نہیں لیا ہے ۔ چناں چہ بہت سے الفاظ چھوٹ گئے ہیں جن کی تشریحات تدبر قرآن میں موجود ہیں۔ تبصرہ نگار نے صرف الف اور ب سے شروع ہونے والے الفاظ پر نظر ڈالی تو ان میں **ارم**، **اوّاب**، **بأساء** ، **بضع** اور **بھیمة** کو غائب پایا، جب کہ مولانا نے اپنی تفسیر میں ان الفاظ کی تشریح کی ہے ۔

درج بالا گزارشات کی روشنی میں کتاب کا اگلا ایڈیشن بہتر بنایا جا سکتا ہے ۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

اشاریہ ماہ نامہ الرشاد اعظم گڑھ (۱۹۸۱۔۲۰۰۲ء) ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ناشر: ندوۃ التالیف والترجمۃ، جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء، ص:۲۳۲، قیمت: ۱۵۰ روپے

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان ماہ نامہ الرشاد اپنے علمی، دینی، فقہی، ادبی، تنقیدی اور تاریخی مضامین و مقالات کی وجہ سے علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ محترم مولانا مجیب اللہ ندوی نے ۱۹۸۲ء میں اس کا اجراء کیا۔ اس وقت سے وہ پابندی سے شائع ہورہا ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے انھیں ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی کی سرگرم معاونت حاصل ہے۔ گزشتہ کچھ دہائیوں سے اشاریہ سازی کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور متعدد علمی و ادبی رسائل کے اشاریے تیار ہوگئے ہیں۔ زیرِ نظر اشاریہ کی مدد سے اہلِ ذوق کو مجلّہ الرشاد کے علمی سرمایہ تک رسائی میں سہولت ہوگی۔

مقالات کا اشاریہ عنوانات، مضمون نگاران اور موضوعات تینوں لحاظ سے تیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح تبصرۂ کتب کی فہرست عنوانات، مصنفین اور مبصرین کے اعتبار سے دی گئی ہے۔ ہر جگہ مکمل تفصیل (ماہ، سنہ، صفحات نمبر) فراہم کی گئی ہے۔

محترم مولانا مجیب اللہ ندوی الرشاد کے اداریوں (بعنوان رشحات) میں بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ ملی، ملکی اور عالمی مسائل پر اظہارِ خیال فرماتے رہے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں انھیں اشاریہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ مناسب تھا کہ ان کا تذکرہ کرکے قوسین میں ہر شمارے کے رشحات کے موضوع کی وضاحت کردی جاتی۔

امید ہے علمی حلقوں میں اس اشاریہ کی پذیرائی ہوگی۔

(محمد رضی الاسلام ندوی)

زیورات میں زکوٰۃ مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی

ناشر: فیض عام اکیڈمی، مئو ناتھ بھنجن (یوپی)، صفحات: ۱۱۲، قیمت درج نہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ جس طرح سونے چاندی میں (اگر وہ مقررہ نصاب کے بقدر ہوں تو) زکوٰۃ واجب ہے اسی طرح سونے چاندی کے مستعمل

زیورات میں بھی (اگر وہ مقررہ نصاب کے بقدر ہوں تو) زکوٰۃ واجب ہے۔ اس کے لیے فاضل مصنف نے قرآن، حدیث اور قیاس سے ٹھوس دلائل دیے ہیں اور مخالف دلیلوں کی کم زوری کو واضح کیا ہے۔

کتاب ایک دیباچہ، ایک مقدمہ، دو ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، مقدمہ میں اموالِ زکوٰۃ خصوصاً سونا چاندی، سونا چاندی کے غیر مباح مصنوعات، مباح زیورات اور ان میں زکوٰۃ کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ باب اول میں زیورات میں زکوٰۃ کے قائلین کے دلائل مذکور ہیں۔ اس میں چار فصلوں کے تحت قرآن، احادیث، آثارِ صحابہ و تابعین اور قیاس کی روشنی میں زیرِ بحث مسئلہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب دوم (جو تین فصلوں پر مشتمل ہے) میں زیورات میں زکوٰۃ کے عدمِ وجوب کے قائلین کے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ چناں چہ مسئلہ زیرِ بحث کے تعلق سے بعض احادیث اور آثارِ صحابہ و تابعین کا جائزہ لیا گیا ہے، پھر قیاس کی روشنی میں عدمِ وجوب کے قائلین کی کم زوری واضح کی گئی ہے۔ خاتمہ میں فاضل مصنف نے پوری بحث کا موازنہ کرتے ہوئے اپنی ترجیح اور اس کے دلائل بیان کیے ہیں اور آخر میں مسلک اہل حدیث کا موقف اور علماء اہل حدیث کے تائیدی اقوال نقل کیے ہیں۔ واضح رہے کہ اس مسئلے میں احناف کا بھی یہی موقف ہے۔

فی الجملہ یہ کتاب زیرِ بحث موضوع پر کافی و شافی ہے۔ فاضل مصنف نے امت کی توجہ ایک ایسے عظیم مسئلے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی ہے کہ اگر وہ اس پر عمل کرنے **لگے** .... تو امت کے بہت سے معاشی و مالی مسائل **حل** ہو سکتے ہیں۔ کتاب کی زبان و بیان ٹھوس اور معیاری ہے، تحقیق و استنباط محدثانہ ہے، بنیادی مآخذ و مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے، کتابت عمدہ، البتہ طباعت اور کاغذ معمولی ہے۔ بعض مقامات پر حوالے مکمل نہیں ہیں جیسے بخاری و مسلم کے ساتھ کتاب و باب کا حوالہ بھی ہونا چاہیے۔ بعض جگہوں پر حوالے قدیم انداز کے دیے گئے ہیں جیسے ترمذی ۲/ ۱۶، جب کہ یہاں بھی کتاب و باب کا حوالہ ہونا چاہیے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ضرورت ہے کہ اس کتاب کو تمام علمی حلقوں میں متعارف کرایا جائے تاکہ امت کے زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہونچے۔

(محمد جرجیس کریمی)